قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

جون 1966

سچے موتی

قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و سلم)

مَنِ اسْتَوٰى يَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ:

جس شخص کی زندگی کے دو دن ایک جیسے گذر جائیں (یعنی اس نے گذشتہ کل کے مقابلہ میں آج کوئی ترقی نہ کی ہو) وہ سخت نقصان میں رہا۔ (الحدیث)

ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

طلوع اسلام کی موجودہ اشاعت پانچ ہزار ہے ۔

اور جس رفتار سے یہ ملک میں مقبول ہو رہا ہے ، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی اشاعت کتنی تیزی سے اور بڑھے گی ۔ نیز اس کا ایک ایک پرچہ کئی کئی لوگ پڑھتے ہیں اور اس کا مطالعہ پاکستان اور بیرونی ممالک کے نہایت بلند پایہ طبقہ میں ہوتا ہے ۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ :

طلوع اسلام میں اشتہار دینے سے

آپ کے کاروبار کو کس قدر پبلسٹی مل سکتی ہے ۔ اشتہارات کے نرخ حسب ذیل ہیں :-

ٹائٹل	ایک بار	سال بھر کا ٹھیکہ
صفحہ نمبر ۲ ، ۳	۱۷۵ روپے	۱۵۰ روپے (فی اشاعت)
صفحہ نمبر ۴	۲۰۰ روپے	۱۷۵ روپے ,,

اندرونی صفحات

پورا صفحہ	۱۲۰ روپے	۱۰۰ روپے ,,
نصف صفحہ	۷۰ روپے	۶۰ روپے ,,

اجرت اشتہار مسودہ کے ساتھ پیشگی آنی چاہئے ۔ اگر کسی اشتہار کا بلاک بنوانا مقصود ہو تو بلاک کی اجرت الگ لی جائے گی ۔ غیر مہذب اشتہارات شائع نہیں کئے جائیں گے ۔

ناظم
ادارہ طلوع اسلام
۲۵-بی گلبرگ ، لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک

سالانہ پاک و ہند سے دس روپے

سالانہ غیر ممالک سے ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاک و ہند سے
ایک روپیہ

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

جلد ۱۹ جون ۱۹۶۶ء شمارہ ۶

فہرست مضامین

(۱) لمعات ———— ۲
(۲) بچوں کا صفحہ —— (زبان سنبھال کر بولو) ———— ۲۲
(۳) باب المراسلات —— (اسلامی کیلنڈر۔ قربانی کا جواز۔ یادِ شہداء۔ ایک آیت کا مفہوم کسانوں کی بے بسی) —— ۲۵
(۴) حقائق و عبر —— (حاجی و نمازی ہندوستان کے مسلمان۔ بھارتی جمہوریت۔ پاکستان کی خانقاہیت۔ ایک روایت) —— ۳۳
(۵) تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف —— (محترم محمد اسلام صاحب) ———— ۴۱
(۶) خدا کی مرضی —— (محترم پرویز صاحب) ———— ۴۹
(۷) بقایا تعارف ———— ۷۷
(۸) چند ضروری باتیں ———— ۷۹

ایڈیٹر صفدر سلیمی ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵ بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

لمعات

قومیں کیسے تباہ ہوتی ہیں؟

آپ انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ یہ قوموں کی نمود و عروج، زوال اور موت کی مسلسل داستان نظر آئے گی۔ ایک قوم افقِ زندگی سے نمودار ہوتی دکھائی دے گی۔ اس کے بعد وہ عروج و ترقی کے نصف النہار تک پہنچ جائے گی۔ پھر اس کا آفتابِ اقبال ڈھلنا شروع ہوگا اور وہ رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد اس کی صرف داستانیں باقی رہ جائیں گی۔ اور جب اس کا آفتابِ حیات غروب ہو رہا ہوگا تو دوسری سمت سے ایک اور قوم جلوہ بار ہوتی دکھائی دے گی۔ اور جن مراحل سے پہلی قوم گزری تھی، یہ بھی انہی سے گزر کر بالآخر موت کے آغوش میں سو جائے گی اور صحیفۂ تاریخ میں اپنی داستان کے ایک ورق کا اضافہ کر جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ کیا قوموں کا یہ عروج و زوال، سورج کے طلوع و غروب کی طرح ہے کہ اسے نہ اپنے طلوع پر کوئی اختیار ہے نہ غروب پر کوئی اقتدار۔ اسے بلا اختیار و ارادہ، ایک خاص وقت پر نمودار ہونا، ایک خاص راستے پر چلنا، اور اس کے بعد ایک خاص وقت پر غروب ہو جانا ہوتا ہے۔ وہ نہ اپنی نمود کے وقت میں ایک ثانیہ کی تقدیم و تاخیر کر سکتا ہے، نہ اپنی مدتِ حیات کو گھٹا بڑھا سکتا ہے اور نہ ہی غروب ہونے میں کسی قسم کا پس و پیش کر سکتا ہے۔

قوموں کی موت و حیات کے لئے بھی اسی قسم کے اٹل قوانین مقرر ہیں۔ لیکن ان میں اور خارجی کائنات کی اشیاء میں ایک بنیادی فرق ہے۔ خارجی کائنات کی اشیاء ان قوانین پر چلنے کے لئے

مجبور ہیں جو ان کے لئے متعین کر دیئے گئے ہیں ـــ سورج نہ اپنے اختیار و ارادہ سے طلوع ہوتا ہے، نہ اپنی خوشی سے غروب۔ وہ طلوع و غروب سے متعلق قوانین کی اطاعت کے لئے مجبور ہے۔ لیکن قوم صاحب اختیار و ارادہ انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس لئے یہ اس کی مرضی پر موقوف ہوتا ہے کہ وہ حیات آور اور عروج بخش قوانین کے اتباع سے حیاتِ جاوداں حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یا ان کی خلاف ورزی سے نسیاً منسیاً ہو جانا چاہتی ہے۔

ایک تصورِ حیات یہ ہے کہ قوموں کی موت اور زندگی کا فیصلہ صرف طبیعی قوانین کی رُو سے ہوتا ہے جو قوم زیادہ سے زیادہ مادی اسباب و ذرائع فراہم کر لیتی ہے۔ طبیعی قوتوں کو مسخر کر کے، اپنے غلبہ و تسلط کو مضبوط سے مضبوط تر کرتی چلی جاتی ہے۔ جنگی ساز و یراق میں باقی قوموں سے آگے بڑھ جاتی ہے ـ یا شاطرانہ روباہ بازیوں سے بساطِ سیاست پر چھائے رہتی ہے، وہ زندگی اور عروج کی مالک بلکہ اجارہ دار بن جاتی ہے۔ جو قوم ان میدانوں میں پیچھے رہ جاتی ہے، کچل دی جاتی ہے۔ یہ تصور یوں تو قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا، لیکن ہمارے زمانے میں اس نے، مغرب کے مادی نظریہ حیات کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل کر لی ہے اور اس وقت، یوں سمجھئے کہ ساری دنیا میں اسی کا دور دورہ ہے۔

دوسرا تصورِ حیات یہ ہے کہ زندگی کے لئے مادی اسباب و ذرائع اور طبیعی قوتوں کی ضرورت لاینفک ہے لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کا راز ان مستقل اقدار کے ساتھ وابستہ ہے جو اس مقصد کے لئے وحی کی رُو سے عطا ہوئی ہیں۔ جو قوم ان اقدار کا تحفظ کرے گی، زندہ رہے گی اور آگے بڑھے گی۔ جو ان سے اعراض برتے گی، مصاف زندگی میں پیچھے رہ جائے گی اور پھر مٹ جائے گی۔ یہ تصور حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے خدا کی طرف سے ملا اور اب (ان اقدار کی تفصیل کے ساتھ) قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ قرآن کریم ان قوانین و ضوابط کا مجموعہ ہے جن کے مطابق قوموں کی موت و حیات اور عروج و زوال کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ قومیں مادی اسباب و ذرائع میں ہزار آگے بڑھ جائیں۔ اگر وہ ان اقدارِ حیات کا تحفظ نہیں کریں گی تو کبھی زندہ نہیں رہ سکیں گی وہ اپنے اس دعویٰ کی دلیل، خود اقوامِ سابقہ کی سرگزشت حیات سے لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> کیا یہ لوگ دنیا میں چل پھر کر دیکھتے نہیں کہ اقوامِ گزشتہ کا انجام کیا ہوا ـــ وہ قومیں قوت و شوکت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ انہوں نے زمین کے سینے کو چیر کر اس میں چھپے ہوئے خزانوں (زرعی اور معدنی پیداوار) کو باہر نکالا۔ ملکوں کو آباد کیا ـــ اُن کی آبادیاں، ان مخاطبین کی آبادیوں سے کہیں زیادہ تھیں ـــ

خدا کے رسول ان کی طرف واضح قوانین و اقدار لے کر آئے ..... لیکن انہوں نے انہیں جھٹلایا اور تمسخر اڑایا۔ اور اپنی اسی روش پر قائم رہے جس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہوتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنہوں نے اس قسم کا ناہمواریاں پیدا کرنے والا نظام قائم کر رکھا تھا خود ان کی اپنی زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہو گئیں۔ ان کا توازن بگڑ گیا اور وہ تباہ و برباد ہو گئے۔

اس حقیقت کو یاد رکھو کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا نے کسی قوم کو یونہی دھاندلی سے تباہ کر دیا ہو۔ قومیں خود اپنے اوپر ظلم کرتی ہیں اور تباہ ہو جاتی ہیں۔ (۳۰/۹-۱۰)

دوسرے مقام پر ہے:۔

کتنی قومیں ایسی تھیں جنہیں مادی سامانِ زیست بڑی فراوانی سے حاصل تھا انہوں نے مستقل اقدار کا تحفظ نہ کیا۔ پھر ان کا انجام کیا ہوا۔ اس کے متعلق، ان کی بستیوں کے ان کھنڈرات سے پوچھو جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ویران ہو گئیں۔ (۲۸/۵۸)

یہ قومیں جاہل۔ وحشی یا غیر مہذب نہیں تھیں جو کہا جائے کہ ان کا یہ انجام جہالت کی وجہ سے ہوا — کانوا مستبصرین۔ (۲۹/۳۸) — وہ سب کچھ جانتی بوجھتی۔ اور دیکھتی بھالتی تھیں۔

ان میں سننے، دیکھنے اور سمجھنے، سوچنے کی بڑی استعداد تھی۔ لیکن جب انہوں نے اقدار خداوندی سے انکار کیا اور ان سے سرکشی برتی۔ تو ان کی سماعت، بصارت اور قلب ان کے کسی کام نہ آ سکا۔ ان کا علم اور عقل، ان کا فہم و تدبر انہیں تباہی اور بربادی سے بچا نہ سکا۔ (۴۶/۲۶)

اور دیکھو۔ ان لوگوں کی ماتھے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوئی تھیں۔ ان میں تو بینائی موجود تھی۔ ان کے دلوں کی آنکھیں اندھی ہوئی تھیں۔ جو سینوں کے اندر چھپے ہوئے تھے۔ (۲۲/۴۶)

یہ "دل کی آنکھیں" کون سی ہیں جن کے اندھا ہو جانے سے قومیں تباہی کے گڑھے میں جا گرتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس حقیقت کو اچھی طرح سن اور سمجھ لو کہ

خدا کسی قوم کی حالت بدلا نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کر لے۔ (۱۳/۱۱)

نفسیاتی تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ وہ نظریہ زندگی کس قسم کا رکھتی ہے۔ اس کا تصورِ حیات کیا ہے، وہ موت

اور حیات کا مدار طبیعی قوتوں پر ہی سمجھتی ہے یا زندگی کی مستقل اقدار کو بھی کوئی اہمیت دیتی ہے۔ اسی کو قوم کی آئیڈیالوجی کہتے ہیں، جسے قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے اور جسے ہم نے سابقہ شمارہ کے لمعات میں، غایتِ حیات (ULTIMATE CONCERN) سے تعبیر کیا تھا۔

کفر کیا ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں — یعنی صحیح نفسیاتی معیار کیا ہے اور غلط کیا۔ اس کی تفصیل میں جایئے تو کتابوں کی کتابیں درکار ہوں گی۔ لیکن قرآن کریم نے اسے دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

> کیا ان لوگوں نے دنیا میں چل کر نہیں دیکھا کہ سابقہ اقوام کا انجام کیا ہوا؟
> وہ خدا کے مقرر کردہ قانونِ موت و حیات کے مطابق تباہ ہو کر رہ گئیں — اور
> یہ بات کچھ انہی تک ہی محدود نہیں — دنیا میں جو قوم بھی کفر کی زندگی اختیار کرے گی
> اس کا انجام ایسا ہی ہوگا،
> یہ کفر کی زندگی کیا ہے؟ حیوانی سطح زندگی جس میں کھانے پینے سے بلند کوئی غایتِ
> حیات نہیں ہوتی۔ (۴۷/۱۰-۱۲)

لہٰذا قرآن کریم کی رُو سے حیوانی سطحِ زندگی کفر کی زندگی ہے اور ایمان یا اسلام کی زندگی وہ ہے جسے انسانی سطح کی زندگی کہا جاتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حیوانی سطحِ زندگی کے نمایاں خط و خال کیا ہیں۔ جب یہ محسوس طور پر سامنے آجائیں گے تو انسانی (یعنی ایمانی) سطحِ زندگی کے سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ حیوانی سطحِ زندگی میں

(۱)— زندگی کی غایت، محض طبیعی ضروریات کا پورا کرنا ہوتا ہے — کھانا، پینا، افزائشِ نسل کرنا، اور مر جانا۔ اس میں اقدار کا تصور ہی نہیں ہوتا۔

(۲)— حیوانی سطحِ زندگی میں تولید (PROCREATION) ہوتی ہے۔ تخلیق (CREATION) کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ حیوان صنعت اور آرٹ دونوں سے بیگانہ ہوتا ہے۔

(۳) حیوانی سطحِ زندگی دَوری (CYCLIC ORDER) کی ہوتی ہے۔ یعنی ایک حیوانی بچے کی غایت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماں باپ جیسا حیوان بن جائے اور پھر اپنے جیسا ایک اور حیوان پیدا کر دے۔ اس میں آگے بڑھنے اور بلند ہونے کا تصور نہیں ہوتا۔ اس میں زندگی ایک ہی مقام پر گردش کرتی رہتی ہے۔ آگے نہیں بڑھتی۔

(۴) حیوان اپنے ماحول کو بدلنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔

(۵)۔ حیوان اپنے جبلی تقاضوں کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسے دو امکانی چیزوں (TWO-POSSIBILITES) میں سے کسی ایک کے چن لینے اور دوسری کو اپنی مرضی سے چھوڑ دینے کا اختیار نہیں ہوتا۔

(۶) حیوان تقلید کا پابند ہوتا ہے۔ وہ اسلاف کا راستہ چھوڑ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ بکری کا بچہ اسی راستے پہ چلے گا جس راستے پر اس کے آباؤ و اجداد چلتے تھے۔ وہ عقل و فکر سے اپنے لئے کوئی نئی راہ تراش نہیں سکتا۔ اس کے لئے جدتِ کردار یا ندرتِ افکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۷) حیوان' انفرادی زندگی بسر کرتا ہے۔ یعنی وہ محض اپنی خاطر جیتا ہے کسی دوسرے کی خاطر نہیں۔ ایک بیل درد سے تڑپ رہا ہو۔ اس کے ساتھ بندھے ہوئے بیل کو اس کا احساس تک نہ ہوگا کہ اسے کیا ہو رہا ہے اور یہ اس کے لئے کیا کر سکتا ہے۔ اگر وہ گلّے کے اندر رہتا ہے تو وہ بھی اس لئے کہ وہ اس طرح زندگی بسر کرنے میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک حفاظتِ خویش سے بلند کوئی مقصد ہوتا ہی نہیں۔

(۸) حیوان ہر اس قوت کے تابع ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہو۔ وہ اس کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں حیوانی سطحِ زندگی کے نمایاں خط و خال۔ اس سطحِ زندگی بسر کرنے والے انسانوں کے متعلق کہا ہے کہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ — یہ انسان نہیں۔ حیوانات کی مانند ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ (۷/۱۷۹)۔ ان کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کی وجہ سے یہ حیوانات سے بھی پست سطح پر جا پہنچتے ہیں۔ مثلاً ایک بیل جب چارہ کھا رہا ہو تو وہ کسی دوسرے بیل کو قریب نہیں آنے دے گا خواہ اُس کی بھوک اس سے کتنی ہی زیادہ شدید کیوں نہ ہو۔ یہ حیوانی سطحِ زندگی ہے — لیکن جب اس بیل کا پیٹ بھر جائے تو وہ آرام سے بیٹھ کر جگالی کرنے لگ جاتا ہے اور اسے اس کی قطعاً فکر نہیں ہوتی کہ باقی ماندہ چارہ کو کون ضرورت مند کھا گیا۔ لیکن انسان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد سامانِ زیست کا ذخیرہ (HOARD) کرتا ہے اور کسی کو اس کے پاس پھٹکنے تک نہیں دیتا۔ خواہ وہ کتنا ہی ضرورت مند کیوں نہ ہو۔ یہ ذہنیت بَلْ هُمْ اَضَلُّ کی ہے — یعنی حیوانی سطح سے بھی پست سطحِ زندگی۔

قرآن کریم کا بتایا ہوا پہلا اصول یہ ہے کہ جس قوم کا تصورِ حیات محض حیوانی سطح کا ہو، اس قوم

کی تہذیب اور تمدن، اس کا نظامِ معیشت و معاشرت، کبھی دیرپا نہیں ہو سکتا۔ وہ قوم کبھی زندہ اور پائندہ نہیں رہ سکتی، وہ معاشرہ کبھی زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ہم نے اوپر بتایا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے حیوانی سطح سے بھی پست تر سطح یہ ہے کہ انسان سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لے۔ اسے قرآن کریم کی اصطلاح میں بخل کہا جاتا ہے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ جس قوم کا نظامِ زندگی ایسا ہو جس میں ہر شخص کو اس کی اجازت ہو کہ وہ جس قدر سمیٹ سکتا ہے اپنے لئے سمیٹ لے، وہ قوم، مصافِ زندگی میں کبھی کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جس کا نظامِ زندگی اس جیسا نہ ہو۔ وہ ایسی قوم کو مخاطب کر کے کہتا ہے؛

تم وہ ہو کہ تمہیں اس کی دعوت دی جاتی ہے کہ اپنی ضروریات سے زائد سامانِ زیست کو نوعِ انسان کی ضروریات کے لئے کھلا رکھو، تو تم بخل کرنے لگ جاتے ہو۔ یاد رکھو جو بخل کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس نے دوسروں کو ضروریات سے محروم کر دیا ہے حالانکہ وہ خود اپنے آپ کو ایک بہت بڑی نعمت سے محروم کرتا ہے ــــ جس خدا نے تمہیں اس کی دعوت دی تھی وہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں۔ تم ہی اسکے محتاج ہو ایسی ذہنیت رکھنے والی قوم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر وہ صحیح روش سے اعراض برتیگی تو اس کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی جو اس جیسی روش اور ذہنیت کی حامل نہیں ہوگی۔ (۴۷/۳۸)

اس قسم کی قوم جب صفحہ ہستی سے مٹنے لگتی ہے تو چلّا اٹھتی ہے کہ ہم نے تو کوئی ایسا خراب کام نہیں کیا تھا۔ ہمیں خدا نے یونہی ذلیل کر دیا ــــ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ــــ اس سے کہا جاتا ہے کہ یاد رکھو! خدا یونہی کسی کو ذلیل نہیں کیا کرتا۔ تم کہتے ہو کہ تم نے کوئی خراب کام نہیں کیا تھا۔ لیکن سوچو کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ

تمہارے معاشرہ میں جس کا جتھہ (پارٹی) بڑا ہوتا تھا تم اس کی تو عزت کیا کرتے تھے لیکن جو تنہا رہ جاتا تھا اس کی کوئی عزت نہیں کرتا تھا۔

پھر کیا یہ حقیقت نہیں کہ تم میں ہزاروں، لاکھوں افراد رات کو بھوکے سوتے تھے، اور تم میں کوئی نہیں تھا جسے ان کی روٹی کی فکر ہوتی اور وہ معاشرہ سے کہتا، کہ اگر تم نے ان کی معاش کا انتظام نہ کیا تو تباہ ہو جاؤ گے؛

پھر کیا یہ واقعہ نہیں کہ تم بجائے اس کے کہ خود محنت کر کے کماتے، تم باپ دادا کی جاگیریں سنبھال کر بیٹھ جانے تھے اور اپنے آپ کو ان کا واحد مالک تصور کر لیا کرتے تھے۔

اور پھر کیا یہ بھی حقیقت نہیں کہ تم نے ایسا نظام قائم کر رکھا تھا جس کی رُو سے دوسروں کی دولت اس طرح تمہاری طرف سمٹی چلی آئے جس طرح اونچی جگہوں کا پانی نشیب کی طرف بہے چلا آتا ہے۔

یہ تھا تمہارا نظام ــــ اور اس کے بعد تم شکایت کر رہے ہو کہ خدا نے تم سے یونہی سرفرازیوں کے مقامات چھین لئے۔ (۸۹/۱۶-۲۰)

آگے بڑھیئے۔ وہ کہتا ہے کہ تباہ ہونے والی قوموں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کے ارباب بست و کشاد

يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا ۔ (۳/۱۸۷)

اسے بہت پسند کرتے ہیں کہ لوگ ان کی ان خدمات کی بنا پر تعریف کریں جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے وہ خدمتِ خلق کا کچھ کام تو کریں نہیں، لیکن جہاں جائیں لوگ ان کا جلوس نکالیں ان کی خدمت میں سپاس نامے پیش کریں۔ ان کی بارگاہ میں حمد و ستائش کے قصیدے پڑھیں۔ انہیں جھک جھک کر سلام کریں ــــ کہا کہ

فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۔ (۳/۱۸۷)

یہ ایسا نہ سمجھ لیں ــــ اپنے آپ کو اس فریب میں نہ رکھیں ــــ کہ وہ تباہی سے بچ جائیں گے وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۳/۱۸۷) بڑی الم انگیز تباہی ان کا انتظار کر رہی ہے۔

دوسرے مقام پر کہا کہ یہ لوگ عزت و اقتدار کی مسندوں پر متمکن تو ہو چکے ہیں لیکن انہوں نے ایسی عظیم ذمہ داریوں کو تماشا سمجھ رکھا ہے۔ اور اپنا فریضہ بس اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ روز ایک بیان دے دیا اور لوگوں سے چکنی چپڑی باتیں کر لیں ــــ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَ يَلْعَبُوْا ــــ انہیں ان کے اس کھیل تماشے اور بیکار باتوں میں الجھا رہنے دو ــــ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ــــ تا آنکہ تباہی کا وقت جس کے متعلق انہیں اس طرح متنبہ کیا جاتا ہے، ان کے سامنے آ کھڑا ہو۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا اقتدار اسی طرح قائم رہے گا۔ یہ غلط ہے۔ اقتدار کا قائم رہنا،

اور چھٹنا ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق ہوتا ہے۔ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْھُمْ ۔ (۷۰/۴۱) ہم اس پر قادر ہیں کہ انہیں ہٹا کر ان کی جگہ ایسی قوم لے آئیں جو ان سے بہتر ہو۔ ہمارا قانونِ استخلاف و استبدالِ اقوام (LAW OF SUCCESSION AND SUBSTITUTION OF NATIONS) بڑا اٹل ہے۔ اور مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ (۵۶/۶۰) ہے۔ اور اس باب میں ہمیں کوئی بھی شکست نہیں دے سکتا۔

اس سے اگلا قانون یہ ہے کہ قوم کو جو سامانِ زندگی فطرت کی طرف سے ملا ہو، اگر اسے غلط طور پر استعمال کیا جائے۔ تو وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ اسے کفرانِ نعمت کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جس قوم کے لیڈر اس قسم کی روش اختیار کر لیں، وہ قوم کو جہنم میں لے جاتے ہیں۔ سورۂ ابراہیم میں ہے:

> کیا تم نے ان رہنمایانِ قوم کی حالت پر بھی غور کیا ہے جنہیں اللہ نے زندگی کی خوشگواریاں فراوانی سے عطا کیں۔ لیکن انہوں نے ان کا بڑا غلط استعمال کیا۔ اور اپنی ملت کے کارواں کو ایسی منڈی میں لا کر کھڑا کر دیا۔ جہاں اس جنس کا سد کا کوئی خریدار نہیں تھا — یعنی انہیں تباہی اور بربادی کے جہنم میں جھونک دیا — یہ کیسی بُری جگہ تھی جہاں انہوں نے اس قافلہ کو لا اتارا؟ (۱۴/۲۸-۲۹)

انہوں نے یہ کچھ کیسے کیا؟ اس سے متعلق اس سے اگلی آیت میں ہے کہ:

> انہوں نے کیا یہ کہ (نام تو لیتے رہے خدا کا لیکن) اس کے ہم پایہ ٹھہراتے رہے غیر خداوندی قوانین کو، تاکہ اس طرح لوگوں کو خدا کے تجویز کردہ راستے سے بہکا کر دوسرے راستے پر ڈال دیں۔
>
> تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم اس روش سے تھوڑے دنوں تک فائدے حاصل کر لو۔ اس کے بعد تم تباہی کے جہنم میں جا گرو گے۔ (۱۴/۳۰)

اس مقام پر قرآن کریم نے قوم کی تباہی کا ذمہ دار راہ نمایانِ قوم (لیڈروں) کو قرار دیا ہے۔ (اور لیڈروں میں، سیاسی راہ نما اور مذہبی پیشوا سب شامل ہیں) لیکن اس نے دیگر مقامات پر اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ اس تباہی کی ذمہ داری تنہا لیڈروں کے سر پر نہیں ہوتی۔ قوم کے عوام بھی اس سے بری الذمہ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ اس لئے کہ لیڈروں کی قوت کا راز تو عوام کی اطاعت میں ہوتا ہے۔ قرآن کریم

عوام کو بھیڑ بکریاں بننے کی تلقین نہیں کرتا کہ گڈریا کا جدھر جی چاہا انہیں ہانک کر لے گیا۔ وہ بھی انسان ہیں اور اپنے فیصلے اور عمل کے آپ ذمہ دار ــــ اس لئے وہ اس عظیم ذمہ داری سے کس طرح سبکدوش ہو سکتے ہیں ان کا سب سے بڑا جرم یہ ہوتا ہے کہ ــــ

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹/۳۱)

یہ اپنے مولویوں اور پیروں کو خدا سے ورے ہی خدا بنا لیتے ہیں ــ

اس آیت کی تفسیر میں نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ علماء و مشائخ کو خدا بنا لینے سے مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو وہ حرام قرار دیں اسے حرام سمجھ لیا جائے اور جسے وہ حلال قرار دیں اسے حلال سمجھ لیا جائے۔ یعنی شریعت کے معاملات میں خدا کی کتاب کو سند و حجت اور قولِ فیصل تسلیم کرنے کے بجائے ان علماء و مشائخ کے اقوال کو سند اور حجت تسلیم کر لیا جائے اور اس نے علماء اور مشائخ کا کردار یہ بتایا ہے کہ

ان کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ وہ جھوٹ اور فریب سے لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف نہ آنے پائیں (کیونکہ اس سے ان کا اپنا اقتدار ختم ہو جاتا ہے) (۹/۳۴)

قرآن کریم نے قوموں کی تباہی میں مذہبی پیشواؤں کے کردار کو بڑی اہمیت دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ باطل کا نظام تنہا مفاد پرستوں کی قوت سے قائم رہ نہیں سکتا جب تک اسے مذہبی پیشوائیت کا "روحانی سہارا" میسر نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی اقتدار اور مذہبی پیشوائیت کا ہمیشہ سے گٹھ جوڑ چلا آیا ہے۔ راجہ، برہمن کی رکھشا (حفاظت) کا پرن لیتا (عہد کرتا) ہے اور برہمن، راجہ کو ایشور کا اوتار بنا کر عوام سے اس کی پرستش کراتا ہے۔ بادشاہ، محافظِ مذہب (DEFENDER OF THE FAITH) بنتا ہے اور پادری اسے اختیاراتِ خداوندی (DIVINE RIGHTS) کی سند عطا کرتا ہے سلطان علماء کے وظائف مقرر کرتا ہے اور علماء اُسے ظلِ اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دے کر، خطبوں میں اس کا نام سلام و صلوٰۃ کے ساتھ لیتے ہیں۔ دیکھئے قرآن کریم ان کے اس گٹھ جوڑ کے متعلق کیسے واضح الفاظ میں بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

جو نبی بھی آیا، اس کی قوم کے بڑے بڑے سرغنے ــ خواہ وہ شہروں میں بسنے والے مہذب افراد تھے یا بدویت کی زندگی بسر کرنے والے غیر مہذب دیہاتی ــ اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے (اس لئے کہ اُس کی دعوتِ انقلاب سے ان کے مفاد پر زد پڑتی تھی) اس کے لئے وہ باہمی خفیہ سازشیں کرتے اور عوام کو اپنے

ساتھ رکھنے کے لئے طرح طرح کی ملمع سازی کی باتیں کرتے ...... ان ملمع سازیوں اور فریب کاریوں سے ان کا مقصد یہ ہوتا کہ جو لوگ دنیاوی مفادہی کو اپنا منتہائے نگاہ سمجھے ہوئے ہیں، ان کی طرف مائل رہیں اور جو کارستانیاں یہ کرتے ہیں وہ بھی ان میں شریک رہیں۔ اور اس طرح سارا معاشرہ انہی کے ڈھب پر چلتا رہے تاکہ کوئی کسی کو روکنے ٹوکنے والا نہ ہو۔ (۶/۱۱۲)

آپ نے غور فرمایا کہ سیاسی مفاد پرستوں اور مذہبی پیشواؤں کی ملی بھگت کو قرآن کریم نے کس طرح بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ وہ توانائیوں کو تباہ کر دینے والے جرائم، سرکشی اور حرام خوری میں سرپٹ دوڑتے چلے جاتے ہیں، کتنے بدقمار ہیں یہ لوگ۔

اور تماشا یہ کہ ان کے علماء و مشائخ بھی انہیں ان جرائم اور حرام خوری سے نہیں روکتے۔ انہوں نے مذہب کو کاروبار بنا رکھا ہے کس قدر گھناؤنا ہے ان کا یہ کاروبار۔ (۵/۶۲-۶۳)

قرآن کریم نے اقوام سابقہ کی سرگزشتیں بیان کرتے وقت ان کے اُن اہم جرائم کو ابھار کر بیان کیا ہے جن کی وجہ سے وہ، اس قدر ساز و سامانِ حیات کے باوجود، تباہ ہوگئیں۔ قوم نوحؑ کی تباہی کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ان کے ہاں عزت و شرف کا مدار، دولت قرار پاگئی تھی۔ اور ان کا دولت مند طبقہ محنت کشوں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ قوم عاد کی حالت یہ تھی کہ مستبد حکمران طبقہ نے عوام کو بُری طرح سے اپنے استبداد کے شکنجوں میں جکڑ رکھا تھا۔ قوم ثمود کا معاشی نظام ایسا تھا جس کی رُو سے رزق کے سرچشموں پر ارباب سطوت کا قبضہ تھا اور غریبوں کے مویشی نہ چشموں پر پانی پی سکتے تھے ۔۔ نہ چراگاہوں میں چر سکتے تھے۔ قوم مدین، صنعت و کاروبار کی حامل تھی۔ لیکن کیفیت یہ کہ نہ مزدور کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملتا تھا، نہ خریدار کو صحیح ناپ تول کے مطابق مال۔ قوم لُوطؑ جنسی بدنہادی میں حدود فراموش واقع ہوئی تھی۔ فرعون کی سیاست یکسر حکمت میکیاولی کا عکس تھی وہ قوم کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے اس کی اجتماعی قوت کو پارہ پارہ کئے رہتا۔ کبھی ایک پارٹی کو اوپر چڑھاتا، کبھی دوسری کو۔ جن لوگوں میں ذرا جوہرِ مردانگی کی نمود دیکھتا، انہیں ذلیل اور تباہ کر دیتا۔ جو ان جوہروں سے عاری ہوتے انہیں بلند مراتب عطا کرتا ـــــ قوم بنی اسرائیل جب اپنے عروج کے بعد، آمادہ بہ زوال ہوئی ہے تو قرآن کریم نے ان کی خرابیوں کو ایک ایک کر کے گنایا ہے۔ وہ کبھی اپنے دعویٰ

پر قائم نہ رہتے (۲/۸۵)۔ معاشرہ میں برائیاں عام ہو رہی تھیں۔ لیکن ذمہ دار طبقہ ان برائیوں کی روک تھام کا کوئی انتظام نہیں کرتا تھا۔ (۵/۶۹) ناجائز طریقوں سے دوسروں کا مال کھا جانے کی روش عام تھی (۴/۱۶۱) ربوٰ (یعنی محض سرمایہ پر منافع لے لینا) ان کے ہاں حرام تھا لیکن اس کا کاروبار کھلے بندوں ہوتا تھا۔ (۴/۱۶۱) حرص و ہوس کا یہ عالم تھا کہ باہمی رضامندی سے طے کرنے کہ ہفتہ میں ایک دن کاروبار کا ناغہ کریں گے۔ (سبت) لیکن چور دروازوں سے کاروبار کرتے رہتے۔ مذہبی پیشواؤں کا جو طبقہ اپنے آپ کو وارثِ کتاب قرار دیتا، وہ چند ٹکوں کے عوض دین فروشی پر اُتر آتا، اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا کہ خدا بڑا غفور الرحیم ہے۔ وہ ہمیں ضرور بخش دے گا۔ (۷/۱۶۹) معاشرہ میں نیکوکاری کا تصور یہ تھا کہ پہلے ایسے حالات پیدا کر دیتے جن کی بنا پر لوگ گھروں سے بے گھر ہو جاتے۔ اور اس کے بعد وہ خیرات کے پیسے اکٹھے کر کے اُن غریب الدیار لوگوں کی بحالی کا انتظام کرتے۔ (۲/۸۵)

اس مقام پر قرآن کریم نے ایک عظیم اصول کی تبیین فرمائی ہے۔ کہا کہ ہمارا ضابطۂ قوانین یہ تھا کہ (۱)۔ معاشرہ میں ایسے حالات نہ پیدا ہونے دو کہ لوگ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محتاج ہو جائیں۔ اور اس طرح غیر انہیں (EXPLOIT) کر سکیں۔ اور (۲) اگر کسی غیر متوقع حادثہ سے ایسی صورت پیدا ہو جائے تو باہمی تعاون سے اس کا فوری ازالہ کیا جائے۔ لیکن لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ پہلے خود ہی ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں اور پھر، نیکی کمانے کی خاطر، خیر خیرات سے ان ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

> کیا تم ہمارے ضابطۂ قوانین کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو؟

بظاہر ایسا دکھائی دے گا کہ کتاب کے جس حصے پر ایمان رکھا جاتا ہے۔ اس کا صلہ تو خدا کے ہاں سے ملیگا! لیکن سنیئے کہ قرآن کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> اس حقیقت کو بگوش ہوش سن رکھو کہ جو شخص ایسا کرتا ہے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ اسے اس دنیا میں بھی ذلت و خواری نصیب ہو اور آخرت میں بھی وہ شدید عذاب میں مبتلا ہو۔ (۲/۸۵)

اس قسم کی نیکی کا ثواب ملنا تو ایک طرف، اس روش سے دنیا اور آخرت دونوں کی ذلت و خواری اور تباہی اور بربادی مسلط ہو جاتی ہے۔ خدا کا ضابطہ ایک غیر منقسم وحدت ہے۔ اسے مانا جائے گا تو پورے کا پورا۔ اور چھوڑا جائے گا تو پورے کا پورا۔ کسی فارمولے کے بعض اجزاء پر عمل کیجئے اور دوسرے

اجزاء کو چھوڑ دیجئے۔ پھر دیکھئے ۔ نتیجہ ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ اور بھی نکلتا ہے ؟

قوموں کے عروج و زوال کے سلسلہ میں، قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ کوئی قوم اپنے انتظامی امور میں کتنا ہی نظم و ضبط کیوں نہ پیدا کر لے لیکن اگر اس معاشرہ میں بنیادی خرابیاں ہیں تو نظم و ضبط کی یہ خوبیاں، ان تخریبی خرابیوں کی تباہ کاری کا ازالہ نہیں کر سکتیں۔ یہ قوم، باوصفِ سعی بسیار، کبھی کامیاب و کامران نہیں ہو سکتی۔ فلاح و بہبود اس کے حصے میں نہیں آسکتی۔ ان بنیادی خرابیوں میں سب سے زیادہ شدید، ظلم ہے۔ اس لئے اس کا قانون یہ ہے کہ :

اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۶/۲۱)

یہ حقیقت ہے کہ ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی ۔

"ظلم" کے عام معنے ناانصافی کے ہیں۔ لیکن یہ لفظ بڑا وسیع المعانی اور جامع ہے۔ اس کے بنیادی معانی ہوتے ہیں ـــــ جس چیز (یا شخص) کو جس مقام پر ہونا چاہیئے اسے اس مقام پر نہ ہونا ـــــ اگر وہ اپنے مقام سے اونچے مقام پر ہے تو بھی ظلم ہے۔ اور اگر اس سے نیچے ہے تو بھی ظلم ہے ـــ اس لئے کمی اور زیادتی دونوں کو ظلم کہتے ہیں۔ کسی کو اس کے حق سے زیادہ دے دیجئے (اسے اس کے صحیح مقام سے اونچا لے جایئے) تو یہ معاشرہ پر ظلم ہوگا۔ اسے اس کے حق سے کم دیجئے (اس کے مقام سے نیچے رکھیئے) تو یہ اس شخص پر ظلم ہوگا۔ قرآن کریم کا غیر متبدل اصول ـــ مستقل قدر ـــ یہ ہے کہ جس معاشرہ کا چلن ظلم پر مبنی ہوگا وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ اسے آخر الامر ناکامی ہوگی۔ وہ تباہ و برباد ہو کر رہے گا۔ یہ ظلم، عدالت کی چار دیواری تک محدود نہیں، زندگی کے ایک ایک قدم پر سامنے آتا ہے۔

زیرِ نظر اصول کے مطابق، جس معاشرہ میں ظلم ہوتا ہو وہ، قرآن کریم کی رُو سے، کبھی پنپ نہیں سکتا دوسری جگہ اسی لئے کہا ہے۔

اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۔ (۱۰/۱۷)

جس معاشرہ میں جرائم عام ہو جائیں، وہ بھی کبھی پنپ نہیں سکتا۔ ظلم کی طرح، جرم کی بھی ایک تعریف (DEFINITION) عدالتی ہے۔ یعنی ملک کے کسی رائج الوقت قانون کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم کہلاتا ہے (اور وہ بھی اس صورت میں جب اسے کوئی عدالت مجرم قرار دے دے) لیکن قرآن کریم کی رُو سے خدا کے کسی قانون کی خلاف ورزی کرنا جرم ہے خواہ ایسا کرنے والے کو کوئی دنیاوی عدالت مجرم قرار دے یا نہ ـــ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق، ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔ اور غلط عمل کے

تباہ کن نتائج کا نام "سزا" ہے۔ اس کے لئے نہ کسی گرفتار کرنے والے سپاہی کی ضرورت ہوتی ہے، نہ مجرم قرار دینے والی عدالت کی حاجت ۔ قوموں کی تباہی عدالتی فیصلوں کی رُو سے نہیں ہوتی۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ہوتی ہے۔

قوانینِ خداوندی کی دو شقیں ہیں۔ ایک کا نام قوانینِ فطرت ہے جن کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے ـــــ ان قوانین کی خلاف ورزی سے طبیعی نقصان ہوتا ہے ـــــ جیسے سنکھیا کھانے سے انسان کی موت واقعہ ہو جاتی ہے ـــــ دوسری شق، ان قوانین پر مشتمل ہے جن کا تعلق انسان کی انسانی سطح زندگی سے ہے ـــــ جیسے کسی کی حق تلفی ـــ!

ان قوانین میں سے کسی قانون کی خلاف ورزی کرنا بھی جرم ہے اور اس کی سزا مل کر رہتی ہے جو قوم دریاؤں کے بند مضبوط طور پر نہیں باندھتی، اس کی بستیاں سیلاب سے برباد ہو جاتی ہیں۔ اور جس قوم میں ظلم عام ہو رہا ہو، وہ بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر تباہی کے اسباب بڑے محسوس ہوتے ہیں اس لئے انہیں ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ لیکن آخر الذکر تباہی کے اسباب غیر محسوس ہوتے ہیں اس لئے انہیں دیکھنے کے لئے دیدۂ بینا کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وہ تباہیاں ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ ـــــ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۔ (۳۹/۲۵) یہ تباہی ان مقامات سے آتی ہے جنہیں تمہاری نگاہیں بھانپ نہیں سکتیں۔ تو میں، عام طور پر، اپنی ساری توجہات طبیعی اسباب و ذرائع پر مرکوز رکھتی ہیں اور ان کا حتی الامکان پورا پورا انتظام اور اہتمام کر لینے کے بعد مطمئن ہو جاتی ہیں کہ ہم تباہی سے محفوظ ہو گئیں۔ ان کی نگاہیں خدا کے ان قوانین کی طرف نہیں اٹھتیں جن کا تعلق انسانوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی سے ہے۔ وہ ان قوانین کی طرف سے بے پروا ہو جاتی ہیں اور اپنے اس جرم کی پاداش میں اس طرح تباہ و برباد ہو جاتی ہیں کہ ان کی سمجھ میں یہ بات ہی نہیں آتی کہ یہ ہوا کیسے؟ قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۔ تو اس سے دونوں قسم کی خلاف ورزی کرنے والے مراد ہیں۔ اسی لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۴/۱۵) ـــ ہر وہ نظریہ، ہر وہ نظام جس میں قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی جائے اور کمزوری کو قوت کے شکنجوں میں کس کر رکھا جائے، تباہ و برباد ہو کر رہتا ہے۔

ان جرائم میں سے بعض کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا اثر صرف ایک فرد تک محدود ہوتا ہے ـــ معاشرہ ان سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس لئے اس قسم کے جرائم قومی تباہی کا موجب کیسے بن سکتے ہیں؟ مثلاً ایک شخص فضول خرچ ہے وہ اس طرح اپنا نقصان کرتا ہے کسی دوسرے کا نہیں۔ ایک شخص

شراب پی کر اپنے گھر میں پڑا رہتا ہے۔ کسی دوسرے سے کچھ نہیں کہتا۔ یا ایک بالغ لڑکا اور لڑکی، باہمی رضامندی سے (بلا نکاح) اپنے جنسی جذبہ کی تسکین کر لیتے ہیں۔ یا کچھ لوگ مل کر جوا کھیلتے ہیں (خواہ اس کی شکل دیسی ہو یا ولائتی)۔ یا لاٹری ڈالتے ہیں ـــــ ان باتوں کا معاشرہ پر کیا اثر ہوتا ہے؟

لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ معاشرہ افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہے۔ جن امور کا خراب اثر افراد پر پڑتا ہے وہ معاشرہ کے لئے بھی خرابی کا موجب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم افراد کی اصلاح کو بنیادی قرار دیتا ہے ـــ اس کے نزدیک معاشرہ کا نظام، درحقیقت افراد کی اصلاح کے لئے ہی ہوتا ہے ـــ اور افراد کی اصلاح کے معنی یہ ہیں۔ کہ ان میں ضبطِ خویش کی صلاحیت پیدا ہو۔ وہ اپنے جذبات کو قانون کے ساحلوں کے اندر رکھیں۔ ان میں محنت کرنے کی عادت ہی نہیں بلکہ ذوق پیدا ہو۔ وہ اپنی عقل و فکر کو ماؤف نہ ہونے دیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس قسم کے (بظاہر) انفرادی عیوب و اسقام کو بھی قومی تباہی کا موجب قرار دیا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔ (۵/۹۰)

اے جماعت مومنین! یاد رکھو ـــ خمر۔ میسرہ۔ انصاب۔ ازلام۔ سب عقل کو ماؤف اور جذبات کو بیباک کر دینے والے کام ہیں۔ ان سے بچو۔ تاکہ تمہیں کامیابی نصیب ہو۔

خمر، ویسے تو شراب کو کہتے ہیں لیکن اس سے درحقیقت ہر وہ شے مراد ہے جس سے انسان کی عقل پر پردے پڑ جائیں۔

میسرہ کے عام معنی تو قمار بازی (جوا) کے ہیں۔ لیکن اس سے مراد ہے وہ دولت جو محنت کئے بغیر ہاتھ آ جائے۔

انصاب و ازلام سے مفہوم قرعہ اندازی ہے لیکن اس سے درحقیقت مراد یہ ہے کہ انسان عقل و فکر، فہم و تدبر، سوچ بچار کے بعد کسی بات کا فیصلہ نہ کرے، بلکہ یہ چاہے کہ ان صلاحیتوں کو کام میں لائے بغیر (اس لئے کہ انہیں کام میں لانے کے لئے ذہنی کاوش کی ضرورت پڑتی ہے) محض "اتفاقی طور پر" (BY ACCIDENT) فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔

اسی طرح اس نے زنا کے متعلق سَاءَ سَبِيلًا۔ (۱۷/۳۲) کہا۔ یعنی ایسی روش جس سے برائیوں کے پھاٹک کھل جاتے ہیں۔ جنسی جذبہ سب سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اگر اسے ضوابط کی حدود کے اندر نہ

رکھا جائے تو انسان کے جذبات حدود فراموش ہو جائینگے۔ اور اس سے معاشرہ میں جو تباہیاں پھیل جائینگی وہ ظاہر ہیں۔

یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ جس معاشرہ میں اس قسم کے انفرادی استفام عام ہو جائیں۔ جن سے ان کی فکری صلاحیتیں ماؤف ہو جائیں ۔۔۔ وہ محنت سے جی چرائیں، لیکن زرطلبی کی ہوس بڑھ جائے، وہ اپنے معاملات کے فیصلے اتفاقات پر چھوڑ دیں۔ وہ اپنے جذبات پر کنٹرول رکھنے کے عادی نہ رہیں۔ وہ معاشرہ ہزار مادی ترقیوں کے باوجود تباہ ہو کر رہتا ہے۔

قرآن کریم نے قوموں کے عروج و زوال ۔۔ بلکہ ان کی حیات و ممات ۔۔۔ کے متعلق جو ابدی قوانین اور غیر متبدل اصول بیان کئے ہیں ۔۔ ان میں سے چند ایک نمایاں قوانین کا ذکر سابقہ صفحات میں کیا گیا ہے ۔۔۔ صرف نمایاں قوانین کا اس لئے کہ (جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے) ان کے تفصیلی تذکرہ کے لئے وسیع گنجائش کی ضرورت ہے۔ ہم چند سطروں میں ان قوانین کے ماحصل کو دہرا دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ بیک نگاہ سامنے آجائیں۔ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ

(۱)۔ جس معاشرہ یا نظام میں غایتِ حیات محض طبیعی ضروریات کی تکمیل، یا حیوانی جذبات کی تسکین ہو، اور وہ مستقل انسانی اقدار کو نظر انداز کر دے، وہ معاشرہ یا نظام تباہ ہو جاتا ہے۔

(۲)۔ جس معاشرہ میں ایسا نظام رائج ہو جس کی رُو سے افراد معاشرہ کو قانوناً اجازت ہو کہ وہ جس قدر جی چاہے اپنے لئے دولت سمیٹ کر رکھ لیں، وہ نظام تباہ ہو کر رہتا ہے اور اس قوم کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔

(۳)۔ جس معاشرہ کا انداز یہ ہو کہ جس کی پارٹی زیادہ اور جتھہ مضبوط ہو، اس کی عزت کی جائے (خواہ وہ جوہر ذاتی کے اعتبار سے کیسا ہی کمزور اور نالائق کیوں نہ ہو)۔ اور جو شخص معاشرہ میں تنہا اور بے آسرا رہ جائے اسے کوئی نہ پوچھے، وہ معاشرہ کبھی پنپ نہیں سکتا۔

(۴)۔ جس معاشرہ کا انداز یہ ہو کہ باپ دادا کی چھوڑی ہوئی دولت کے مالک (نہ وہ جنہوں نے ذاتی محنت سے کوئی مقام حاصل کیا ہو) مناصب و وجاہت کے اجارہ دار قرار پا جائیں وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔

(۵) جس معاشرہ میں ذمہ دار ارکان کی ذہنیت یہ ہو کہ اُن کی اُن خدمات کیلئے تعریف کی جائے، جو خدمات وہ درحقیقت سرانجام نہیں دیتے، وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔

(۶)۔ جس معاشرہ میں زور محض باتوں پر دیا جائے۔ اور اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو مذاق یا تفریح سمجھ لیا جائے۔ وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔

(۷) جس معاشرہ میں فطرت کے عطا کردہ اسباب و وسائل کی تقسیم ناہموار اور استعمال غلط ہو، یا اس میں خدا کا نام لیکر اپنی من مانی کی جائے، وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔

(۸) جس معاشرہ میں مذہبی پیشوا ایسی پوزیشن حاصل کر لیں کہ ان کی پسند کیخلاف کوئی کام نہ ہو سکے۔ اور یوں وہ خدائی اختیارات کے حامل بن جائیں ـــ وہ معاشرہ کبھی زندہ اور قائم نہیں رہ سکتا۔

(۹) جس معاشرہ میں محنت اور مزدوری کو ذلت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔
جس میں کمزوروں کا گلا گھونٹ دیا جائے۔
جس میں رزق کے سرچشموں پر اربابِ قوت قابض ہو جائیں۔
جس میں نہ مزدور کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملے، نہ خریدار اور صارف کو ادا کردہ قیمت کے برابر مال۔
جس معاشرہ میں ـــ سیاست کا مدار پارٹیوں کے اتار چڑھاؤ پر ہو۔ اور مقربین وہ ہوں جو جوہرِ مردانگی سے عاری ہوں۔
جس میں وعدوں کا اقرار باقی نہ رہے۔
جس میں برائیوں کی روک تھام کا انتظام نہ ہو۔
جس میں ہر شاطر دوسرے کا مال ناجائز طریق سے کھا جائے۔
جس میں ربوٰ (یعنی محض سرمایہ پر منافع) اندازِ معیشت بن جائے۔
جس میں چور بازاری عام ہو جائے۔
جس میں دین فروشی کھلے بندوں ہو ـــــ
ـــــ وہ معاشرہ تباہ ہو کر رہتا ہے۔

(۱۰)۔ جس معاشرہ میں کیفیت یہ ہو کہ پہلے ایسا نظام رائج کر دیا جائے جس کی رُو سے غریب، غریب تر اور کمزور، کمزور تر ہوتے چلے جائیں۔ اور پھر ان غریبوں اور کمزوروں کے لئے چندوں کی اپیل کی جائے اور "خدمتِ خلق" کے شعبے کھولے جائیں۔ اس معاشرہ کا حال بھی تباہ ہوتا ہے۔ اور مستقبل بھی تاریک۔

(۱۱)۔ جس معاشرہ میں دین خداوندی سے اس قسم کا سلوک ہوتا ہو کہ اس کی جن شقوں کو اپنے لئے مفید مطلب سمجھا، ان پر عمل کر لیا اور جن سے اپنے مفاد پر زد پڑتی ہو انہیں نظرانداز کر دیا۔ وہ معاشرہ ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔

(۱۲)۔ جس معاشرہ میں ظلم عام ہو ــــ یعنی جس شے کو جس مقام پر ہونا چاہیئے، وہ وہاں نہ ہو ــــ جس میں جرائم ــــ یعنی قوانینِ خداوندی سے سرکشی ــــ کا دور دورہ ہو۔ یا جس میں زنا، فواحش، شراب (منشیات)، جوا (ریس وغیرہ)، یا قرعہ اندازی (لاٹری۔ سٹہ)، یا دیگر ایسی وبائیں عام ہوں جن سے انسان کی عقل و فکر ماؤف ہو جائے ــــ وہ محنت کا عادی نہ رہے ــــ ہر وقت اس دُھن میں رہے کہ کسی طرح یونہی مال ہاتھ آجائے۔ وہ معاشرہ بھی تباہ ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ قوانین جن کے متعلق کہا گیا کہ ــــ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ (۳۳/۶۲) ــــ تو ان قوانینِ خداوندی میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔ یہی نہیں کہ ان میں ازخود کوئی تبدیلی نہیں ہوگی بلکہ یہ بھی کہ کوئی "مائی کا لال" ایسا نہیں کہ جو ان میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ (۶/۳۴)۔ یہ قوانین نہ مشرق کے لئے ہیں نہ مغرب کے لئے۔ (یہ ساری دنیا کے لئے ہیں۔) ان میں نہ یورپ کی تخصیص ہے نہ ایشیا کی ــــ نہ کالے کی تمیز ہے نہ گورے کی ــــ نہ حجاز کی خصوصیت ہے نہ پاکستان کی ــــ یہ فطرت کے قوانین کی طرح عالمگیر ہیں اور زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ــــ حتیٰ کہ ان کی یہ کیفیت بھی نہیں کہ جو ان قوانین کو صحیح مانے، ان کا اثر اسی پر ہو ــــ جو صحیح نہ مانے، اسے یہ کچھ نہ کہیں۔ دنیاوی سلطنتوں کے قوانین کا اطلاق صرف انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو انہیں صحیح تسلیم کریں (یعنی جو اس سلطنت کے شہری ہوں) کسی دوسری مملکت کے شہری پر ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن خدا کی مملکت" تو ساری کائنات کو محیط ہے۔ اس لئے اس کے قوانین کا اطلاق ہر مقام پر ہوتا ہے جس طرح یہ نہیں ہوتا ہے کہ سنکھیا اُسی کو ہلاک کرے جو اُسے مہلک سمجھے۔ جو اسے مہلک نہ سمجھے اُسے سنکھیا کچھ نہ کہے۔ اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ان قوانین کی خلاف ورزی سے صرف وہی قوم ہلاک ہو جو ان کی صداقت پر ایمان رکھے۔ اور جو انہیں سچا نہ سمجھے، اس پر ان کی خلاف ورزی کا کوئی اثر نہ ہو ــــ یہ "اقوامِ عالم" کے عروج و زوال سے متعلق قوانین ہیں اور ان کا اطلاق دنیا کی ہر قوم پر، ہر زمانے میں ہوتا ہے۔

نہ ہی ان کی یہ کیفیت ہے کہ جو قوم اپنے آپ کو خدا پرست کہے (یعنی مسلمان نام رکھائے) یہ قوانین اس کی کچھ رعایت کر دیں۔ اس میں کسی کی رعایت کا بھی کوئی سوال نہیں۔

ــــــ ❊ ــــــ

آپ ان قوانینِ خداوندی کو سامنے رکھئے۔ اور پھر اپنی حالت پر غور کیجئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تشکیل پاکستان کے بعد ہم نے کافی صنعتی ترقی کر لی ہے۔ یہ امر موجبِ اطمینان ہے لیکن اس کا تعلق تو خدا کے طبیعی قوانین سے ہے۔ سوال یہ ہے کہ جہاں تک ان قوانین خداوندی کا تعلق ہے جن سے ہماری انسانی زندگی وابستہ ہے۔ اور جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان کی رُو سے ہماری حالت کیا ہے؟ اس کے متعلق، کوئی دو آراء ہو نہیں سکتیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں ان قوانین کی خلاف ورزی ہو رہی ہے اور بھرپور انداز سے ہو رہی ہے۔ تو اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر ہمارا ایمان ہے کہ ــــ

(۱) یہ قوانین خدا کے ہیں ــــ اور

(۲) ان کی خلاف ورزی کرنے کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے۔

ــــ تو کیا پھر ہمیں ہماری مادی ترقی یا دنیا کی کوئی قوت ہمیں اس تباہی سے بچا سکتی ہے جو ان قوانین کی خلاف ورزی کا فطری اور اٹل نتیجہ ہے۔

کہا جا سکتا ہے (اور اکثر و بیشتر کہا جاتا ہے) کہ ہم نے صرف مادی ترقی نہیں کی۔ خدا کے فضل سے دینی ترقی بھی بہت کی ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ پاکستان میں مساجد کی تعداد میں کس قدر اضافہ ہوا ہے۔ کتنے دینی مدارس کھل گئے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کو بطور نصاب داخل کر لیا گیا ہے۔ وعظ و اذکار کی محفلیں کس قدر پُر رونق ہوتی ہیں۔ رمضان المبارک کے احترام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی "دینی خدمات" ان قوانین خداوندی کی خلاف ورزیوں کا کفارہ بن سکتی ہیں جن کا تعلق قوموں کی موت و حیات سے ہے۔ ہم اپنی خوش عقیدگی یا ابلہ فریبی کی بنا پر کچھ ہی کیوں نہ کہہ لیں قرآن کریم سے تو اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ سنئے وہ اس باب میں کیا کہتا ہے؛ وہ کہتا ہے کہ

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

کیا تم اس قسم کی دینی خدمات کو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دیں یا عام مساجد تو ایک طرف، خود خانۂ کعبہ کی تزئین و آرائش کر دی، ایسے شخص کے اعمال کے برابر سمجھتے ہو جو خدا اور اس کے قوانینِ مکافات کی صداقت پر یقین رکھتا

ہے۔ اور پھر (قوانینِ خداوندی کے مطابق) نوعِ انسانی کی منفعت اور بہبود کے کاموں کے لئے مسلسل کوشش کرتا ہے؛ تم اپنی خوش عقیدگی کی بنا پر جیسا جی میں آئے سمجھ لو ۔۔۔ خدا کے نزدیک تو یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ ایسا تصور کرنا ظلم ہے اور یہ حقیقت ہے کہ خدا ظالم قوم کے لئے کامیابی کی راہیں نہیں کھولا کرتا۔

دوسری جگہ ہے:۔

نیکی اور کشادگی کی راہ یہ نہیں کہ تم مشرق کی طرف اپنا منہ کرتے ہو یا مغرب کی طرف، حقیقی نیکی اور کشادگی کی راہ اس کی ہے جو خدا کے بتائے ہوئے بنیادی ارکان کی صداقت پر ایمان رکھے ۔۔۔ یعنی خدا۔ یومِ آخرت۔ ملائکہ۔ کتب اور انبیاء پر ایمان ۔ اور مال و دولت کی محبت کے باوجود، اسے دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دے۔ وہ لوگ اس کے گردوپیش کے رشتہ دار ہوں یا وہ جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں، یا جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ یا ان میں کام کاج کی استعداد نہ رہے۔ یا ضرورت مند مسافر۔ یا ایسے لوگ جن کی کمائی اُن کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہو۔ یا جو دوسروں کی محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں ۔ اور وہ نظامِ صلوٰۃ قائم کرے۔ نوعِ انسان کی نشو و نما کا اہتمام کرے اپنے عہد و پیمان کا احترام کرے۔ قول و اقرار کا پکا ہو ۔۔۔ حق و صداقت کی راہ میں جس قدر مصائب و مشکلات کا سامنا ہو، ان کا استقامت کے ساتھ مقابلہ کرے ۔۔۔!

یہ ہیں وہ لوگ ۔۔۔ جو اپنے دعوئے اسلام میں سچے ہیں اور انہی کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ متقی ہیں۔ (نہ وہ جو چند رسومات کی ادائیگی سے مومن بننے کے مدعی ہوں۔ اور اسے دین کی خدمت قرار دے دیں۔) (۲/۱۷۷)

مساجد اور اس میں پڑھی جانے والی نمازیں اپنی جگہ پر ہیں۔ لیکن اگر یہ چیزیں دین کے نظام کا جزو نہیں، تو یہ اس قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتیں جو ان قوانین کی نگہداشت نہیں کرتی، جن سے قوموں کے عروج و زوال کا سوال وابستہ ہے۔

اندرونی حالات ۔۔۔، ہم ملک کے صاحبِ فکر و ہوش طبقہ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا

انہوں نے کبھی کھڑے ہوکر یہ سوچنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے کہ جو معاشرہ یہاں قائم ہے، اُس کی رُو سے، خدا کے اٹل قوانین کے مطابق، ہم کتنے دن زندہ رہ سکتے ہیں؟ صدارتی یا پارلیمانی نظام ۔ بنیادی جمہوریتیں، یا براہِ راست انتخاب ۔ وفاقی یا وحدانی نظامِ حکومت ۔ یہ اور ان جیسے دیگر مسائل کی حیثیت ثانوی ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ ہمارا نظام ان قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو جو قوموں کی زندگی کے ضامن ہیں۔ اگر ہمارا نظام ان قوانینِ خداوندی کے مطابق نہ ہوا۔ تو ہمارے قصرِ مملکت کو نہ سیاسی پچی کاریاں بچا سکیں گی نہ مذہبی سفیدیاں ۔ فھل من مدّکر ۔ سو ہے کوئی جو اس حقیقت پر غور کرے؟

احباب کی خدمت میں

میری صحت ایک عرصہ سے خراب چلی آرہی تھی اور کام کی کثرت کی وجہ سے وہ خراب تر ہوتی چلی گئی۔ حتےٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مجھے لاہور چھوڑ کر اپنے گاؤں آجانا پڑا جہاں میں آج کل صاحبِ فراش ہوں۔ معلوم نہیں یہ صورت کب تک رہے اور میں کب تک پھر کام کے قابل ہوسکوں۔ لاہور سے یہ بُعد صرف جسمانی ہے۔ جہاں تک میرے قلب اور ذہن کا تعلق ہے وہ ادارہ طلوعِ اسلام، اس کی تحریک اور اس کی قرآنی فکر سے پیوست ہے۔ کہ یہ پیوستگی میری زندگی کا جزو ہے۔

یہ اطلاع اس لئے دے رہا ہوں کہ جو احباب اس دوران مجھے کچھ نجی طور پر لکھنا چاہیں وہ ذیل کے پتہ پر خطوط رکھیں۔

صفدر سلیمی
نورمحل۔ براستہ ٹوبہ ٹیک سنگھ
ضلع لائل پور

بچوں کا صفحہ

زبان سنبھال کر بولو

آج کا دور مقابلے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے، ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کا دور ہے۔ اتھلیٹ پیدل چلتے ہیں، دوڑتے ہیں، لمبی دوڑ لگاتے ہیں، دور اور اونچی چھلانگ لگانے میں، گولہ اور نیزہ پھینکنے میں اور اسی طرح کے بیشمار اور جسمانی کرتبوں کے مقابلوں میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سائیکل سواری اور موٹر سواری کے مقابلے ہوتے ہیں۔ گھوڑے دوڑانے کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ہوا باز ہوا میں اڑان کر کے ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب ہوا کی یہ دوڑ اور اونچی، اور وسیع ہو کر خلا میں پہنچ گئی ہے اب مقابلہ یہ آن پڑا ہے کہ کون چاند پر پہلے اترتا ہے اور وہاں اپنے قدم جما کر مریخ، زہرہ اور اس سے بھی اوپر کہکشاں کی راہوں پر کون پہلے رواں ہوتا ہے۔

تعلیم کے میدان میں جماعت پر سکول ہیں کالج ہیں، ضلع اور ڈویژن میں، ثانوی بورڈ میں، اور یونیورسٹی میں اول آنیکا مقابلہ ہوتا ہے۔ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ میں تیز رفتاری اور زود نویسی کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اخباروں کو خبریں مہیا کرنے والے ٹیلی پرنٹر زیادہ سے زیادہ تیز رفتار ہوتے جا رہے ہیں تاکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ خبریں پہنچائی جاسکیں۔ ہر نئی بننے والی موٹر، ہر نئی چلنے والی ریل گاڑی، فضا کو چیرنے والا ہر نیا طیارہ پہلے کے مقابلہ میں زیادہ تیز رفتار ہوتا ہے۔

گویا یہ ساری زندگی ایک دوڑ، ایک مقابلہ ہے آگے بڑھ جانے کا جذبہ انسان کو چین نہیں لینے دیتا اور اسکی یہی بےچینی اس کی ترقی کا باعث بنتی ہے۔ ہم کو جب یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ چلنے والے ہم سے آگے نکل گئے ہیں تو ہم اپنے قدموں کی رفتار تیز کر کے ان تک پہنچ جاتے ہیں، اور پھر اور تیز ہو کر ان سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

پچھلے دنوں ایک خبر آئی تھی کہ ایک شخص ایک سو بتیس (۱۳۲) گھنٹے لگاتار باتیں کرتا رہا اور اس طرح اس نے مسلسل بولتے رہنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ دوسرے لفظوں میں دنیا کا سب سے باتونی شخص آسٹریلیا کا یہ باشندہ ہے۔

تم مقابلے کی ساری دوڑوں میں حصہ لینے کی کوشش کرو مگر ایک مقابلے سے دور ہی رہو تو بہتر ہے۔ تمہارے لئے بھی اور دوسروں کیلئے بھی۔ یہ ہے بولنے کا مقابلہ۔ اگر آسٹریلیا کا یہ باتونی شخص ایک سو بتیس گھنٹے، یعنی چھ دن اور پانچ رات متواتر بولتا رہا ہے تو تم اسکا ریکارڈ توڑنے کی کوشش نہ کرنا۔ مقابلے کا شوق چل نکلا تو سب لوگ بولنا شروع کر دینگے کوئی کسی کی سنے گا نہیں، اور دنیا کے

کام کاج دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

انسان اور حیوان میں جو بہت سے فرق ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انسان کو گویائی، یعنی بولنے کی، باتیں کرنے کی طاقت دی گئی ہے اور حیوان اس طاقت سے محروم ہیں۔ گوشت کا وہ لوتھڑا جسے ہم زبان کہتے ہیں۔ انسان اور حیوان دونوں کے منہ میں ہوتی ہے مگر انسان باتیں کرتا ہے اور حیوان باتیں نہیں کرتا۔ اس لحاظ سے زبان قدرت کی کتنی بڑی نعمت ہے ہم زبان کے ذریعے اپنے دل کی بات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ اپنی خوشی اپنی غمی دوسروں کو سنا سکتے ہیں۔ زبان کو اور گلے کو کچھ قاعدوں کا پابند کر کے اور ان کا استعمال ایک خاص سلیقے سے کر کے ہمارے منہ سے نغمے پھوٹ سکتے ہیں ان نغموں کی وجہ سے ہماری زندگیوں میں کتنی رنگینی کتنی چاشنی رہتی ہے۔

مگر یہی زبان — قدرت کی یہ گرانقدر نعمت — بڑی مصیبتیں بھی پیدا کرتی ہے۔ اس کے غلط اور ناجائز استعمال سے کئی فتور پیدا ہوتے ہیں۔ تم ہمدردی کی باتیں کر کے اسی زبان کو زخمی، مریض یا کسی اور دکھی کے دکھ کا مداوا کر سکتے ہو۔ اور بد زبانی کر کے گالیاں دے کر زخمیوں کے زخم ادھیل سکتے ہو اور دکھی لوگوں کا دکھ بڑھا سکتے ہو۔ ہمارے آس پاس روزمرہ جو جھگڑے ہوتے ہیں، انکی بڑی وجہ زبان کا غلط اور غیر محتاط استعمال ہے ہم بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات سوچے بغیر بات کر جاتے ہیں۔ اسی لئے دانا لوگ کہتے ہیں کہ پہلے تولو پھر بولو۔ بولنے سے پہلے سوچ لو کہ تمہارے منہ سے جو بات نکلنے والی ہے اسکا کوئی خراب اثر تو نہیں ہوگا۔ منہ سے بات نکلی اور ہوا ہو گئی وہ واپس نہیں لی جا سکتی۔ واپس لی بھی جا سکتی ہے مگر بہت خرابی کیساتھ۔ لہٰذا آج سے طے کر لو کہ فوری طور پر تمہارے دل میں جو بات آئے اُسے تم سوچے بغیر زبان پر نہیں لاؤ گے۔ ایسا کرنے سے تم بعد کی تکلیف شرمندگی اور ندامت سے بچ سکتے ہو۔

زبان کو بے لگام رکھنے سے یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک شخص تم سے کوئی بات کرنے لگتا ہے، کوئی لطیفہ کوئی شعر یا کوئی واقعہ سنانے لگتا ہے۔ تم ایک دو فقرے یا شعر کا ایک مصرع سنکر اُسے ٹوک دیتے ہو کہ "یہ تو مجھے پہلے ہی پتہ ہے" اس سے بات سنانے والے کی دل شکنی ہوتی ہے۔ اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اس کی بات اس بات سے مختلف ہو جو تم جانتے ہو۔ اس طرح تم ایک اچھی، دلچسپ بات سے محروم ہو جاؤ گے اگر تمہیں وہ لطیفہ یا واقعہ پہلے ہی معلوم ہے جو دوسرا تمہیں سنانے لگا ہے اور تم اسے دلچسپی سے اور خاموشی سے سن لو تو اس سے بات آگے چل سکتی ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا انداز بیان اسے اور دلچسپ بنا دے۔ زبان کو قابو میں رکھنے سے آدمی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ ورنہ یہ ہوگا کہ تم ہر بات پر یہ کہہ دو گے۔ "یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم ہے" اور کچھ وقت کے بعد دوسرے تمہیں باتیں سنانا ہی چھوڑ دیں گے۔ طالب علم کی، یعنی اس آدمی کی جو نئی سے نئی باتیں سیکھنا چاہے خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کان کھلے اور زبان بند رکھتا ہے۔ وہ بولتا اسی وقت ہے جب اسے کچھ پوچھنا

ہوتا ہے، کوئی بات سمجھنی ہوتی ہے۔

بعض اوقات زبان کا بے دریغ استعمال بھی ہوتا ہے کہ تم ایک محفل میں بیٹھے ہوئے ہو۔ کچھ لوگ کسی خاص موضوع ـــ علمی، سیاسی کسی موضوع ـــ پر باتیں کر رہے ہیں۔ تم یہ محسوس کرتے ہوئے بھی کہ تم اس موضوع کے متعلق کچھ نہیں جانتے یا بہت کم جانتے ہو، محض اس لئے بول پڑتے ہو کہ دوسرے تمہیں جاہل نہ سمجھ بیٹھیں اور جب تم بولتے ہو تو فی الواقع دوسروں کو یہ یقین آجاتا ہے کہ تم جاہل ہو۔ جب بھی تم محسوس کرو کہ تم کسی خاص موضوع کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ تو تمہارے لئے بہترین طریقہ یہی ہے۔ کہ خاموش رہو۔ خاموشی سے دوسروں کی باتیں سنو اگر کچھ جانتے ہو تو اتنی بات کرو جتنا تمہیں علم ہے اپنے علم کا رعب ڈالنے کی کوشش کرو گے۔ تو اپنی جہالت کو اور زیادہ آشکار کرو گے۔ علم سے فخر نہیں، انکسار پیدا ہوتا ہے۔

ہماری ایک اور عام عادت ہے ـــ کہ ہم میں سے ہر شخص دوسرے پر تنقید کرتا ہے۔ دوسرا تیسرے پر اور تیسرا چوتھے پر نکتہ چینی کرتا ہے، اور یہ سلسلہ یونہی آگے چلتا جاتا ہے اب ذرا سوچو ـــ کہ اگر ہر شخص دوسرے کو برا کہتا ہے۔ تو دنیا میں فی الواقعہ برا کون ہے ـــ اور اچھا کون ـــ؟ ہر شخص بے مروتی، بے وفائی بے ایمانی کی شکایت کرتا ہے، پھر بے مروت، بے وفا، بے ایمان کون ہے؟ ـــ دراصل ہماری خرابی یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص بولے جا رہا ہے سب لوگ بولے جا رہے ہیں۔ اس خرابی کا علاج یہ ہے کہ آج سے ہم بولنا کم کر دیں اور جو خوبیاں ہم کو دوسروں میں نظر نہیں آرہیں۔ وہ اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے پہل کریں۔ ہم کچھ روز خاموش رہ کر اپنے آپ کا جائزہ لے لیں کہ وہ خرابیاں جن کا ہم اس قدر چرچا کر رہے ہیں خود ہمارے اندر بھی تو موجود نہیں ـــ اس جائزے کے بعد ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اصلاح کا آغاز ـــ دوسروں کے بجائے اپنی ذات سے کرنا چاہیئے ورنہ یہ ہوگا کہ ـــ ہم بولتے جائیں گے، سب بولتے جائیں گے۔ اور اصلاح کہیں سے بھی شروع نہیں ہو سکے گی۔

زبان کو قابو میں رکھو،
زبان سنبھال کر بولو،

ایسا نہ ہو کہ لوگ تمہارے گونگا ہونے کی بددعائیں کرنے لگیں۔

(یونس بھائیجان)

باب المراسلات

اسلامی کیلنڈر

سوال :۔ کیلنڈر کو عام معاملات میں جو اہمیت حاصل ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کاروبار اسی صورت میں چل سکتا ہے کہ آنے والی تاریخوں اور دنوں کا یقینی طور پر علم ہو۔ قمری کیلنڈر سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ بکاروبار تو ایک طرف، اس سے اسلامی تہواروں تک کا بھی تعین نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ ہم از روئے اسلام قمری کیلنڈر رکھنے پر مجبور ہیں یا اسے شمسی کیلنڈر میں بدلا جا سکتا ہے؟

جواب۔ قرآن مجید میں چاند اور سورج دونوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ حساب رکھنے کا ذریعہ ہیں۔ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ حُسْبَانًا (۶/۹۷ و دیگر مقامات) چاند کی رو سے حساب کے سلسلہ میں، کیلنڈر کے علاوہ، مد و جزر وغیرہ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ ساحل سمندر کے رہنے والے کر سکتے ہیں۔ جہاں تک کیلنڈر کا تعلق ہے۔ بدوی یا دیہاتی زندگی میں جب (اور جہاں) حساب رکھنے میں دقت ہو، چاند کی رُو سے تاریخوں کا اندازہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ایام میں عام طور پر چاند ہی کی رُو سے حساب رکھا جاتا تھا۔ یہودیوں کے ہاں، نیز ایران اور ہندوستان میں قمری کیلنڈر رائج تھا۔ لیکن اس کیلنڈر میں ایک نقص یہ تھا کہ اس کی رُو سے ہر سال ایک خاص دن اُسی موسم میں نہیں آتا تھا۔ موسموں کی تبدیلی سورج کی رُو سے ہوتی ہے۔ اور قمری کیلنڈر ہر سال (قریب) دس دن پیچھے رہ جاتا ہے۔ یہودی، ایرانی اور ہندی اپنے مذہبی تہواروں کو خاص موسموں میں منانا چاہتے تھے۔ اور یہ چیز قمری کیلنڈر کے رو سے ممکن نہ تھی۔ اس مشکل کو رفع کرنے کے لئے انہوں نے کیا یہ تھا کہ وہ ہر تیسرے سال ایک مہینے کا اضافہ کر کے، سال 'بارہ' کے بجائے تیرہ مہینے کا شمار کر لیتے تھے

اس طرح تیوہار منانے میں، ہر سال چند دنوں کا فرق تو ضرور پڑتا تھا لیکن موسم وہی رہتا تھا اور تیسرے سال کے بعد پھر تیوہار اپنے پہلے وقت پر آجاتا تھا۔ ظہور اسلام سے پہلے عرب بھی، یہودیوں کے تتبع میں ایسا ہی کرتے تھے۔ ان کے ہاں کیلنڈر قمری تھا۔ لیکن وہ ہر تیسرے سال ایک ماہ کا اضافہ کر کے، اسے شمسی کے برابر کر لیتے تھے اور اس طرح ان کے تیوہار (بالخصوص حج، جو ان کا سب سے بڑا مرکزی اور قومی تیوہار تھا) ایک ہی موسم میں آتے تھے۔

لیکن عربی معاشرہ میں ایک اور رسم بھی تھی۔ انہوں نے سال میں چار مہینے (ذی قعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب) ایسے متعین کر رکھے تھے جن میں لوٹ مار اور جنگ و جدال منع تھا۔ انہیں حرمت کے مہینے کہا جاتا تھا۔ جب سال تیرہ مہینوں کا آتا تو حرمت کے مہینوں کا تعین مشکل ہو جاتا۔ یہ فریضہ کعبہ کے پجاریوں میں سے ایک قبیلہ کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ (جیسا کہ ہر جگہ پجاریوں کے ہاں ہوتا ہے) اپنے اس اختیار کا بڑا ناجائز فائدہ اٹھاتے۔ وہ خاص مفادات کے پیشِ نظر ان مہینوں میں رد و بدل کرتے رہتے تھے۔ اسے اصطلاح میں نسئی کہا جاتا تھا۔ وہ لوند کے سال کے علاوہ ویسے بھی ان مہینوں میں رد و بدل کر دیتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جب حج کا اہتمام جماعتِ مومنین کے ہاتھ میں آیا تو دیگر امور کے ساتھ، کیلنڈر میں بھی خاص اصلاح کی گئی۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے یہ فیصلہ کر دیا کہ

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ
يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ
الْقَيِّمُ۔ (۹/۳۶)

یاد رکھو! مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔ اور یہ اس قانونِ فطرت کے مطابق ہے جسے خدا نے تخلیقِ ارض و سما کے وقت سے نافذ کر رکھا ہے۔ ان میں چار مہینے حرمت کے ہیں

یہی نظام محکم ہے۔

قانونِ فطرت کے مطابق، زمین سورج کے گرد، قریب ۳۶۵ دن میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے۔ اس کو ایک سال کہا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بارہ مہینوں میں ایک سال (یعنی زمین کا چکر) اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ۳۶۵ دنوں کو بارہ پر تقسیم کر کے مہینے مقرر کر لئے جائیں۔ یہ شمسی حساب ہی سے ہو سکتا ہے۔ قمری کیلنڈر کی رو سے سال کے قریب ۳۵۴ دن بنتے ہیں۔ اس میں سورج کے گرد، زمین کا چکر پورا نہیں ہوتا۔ اس حساب سے ہمارا کیلنڈر شمسی ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ہم نے سال کے مہینے تو بارہ کر لئے لیکن کیلنڈر قمری رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہمارے

تیوہار مختلف موسموں میں آتے ہیں۔ اور ہمارا سال بھی شمسی کے مقابلہ میں دس دن کم رہتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنا کیلنڈر شمسی رکھ لیں تو یہ اسلام کے خلاف نہیں ہوگا۔ بلکہ قرآن کی منشاء کے مطابق ہوگا۔ اس سے ہمارے تیوہار بھی متعین موسموں میں آیا کریں گے اور وہ تمام دشواریاں بھی رفع ہو جائیں گی جو قمری حساب کی رُو سے آئے دن پیش آتی رہتی ہیں۔ نیز اس سے "دین اور دنیا کی وہ ثنویت" بھی ختم ہو جائے گی جس کی رُو سے ہمیں کاروبار کے لئے ایک قسم کا (شمسی) کیلنڈر استعمال کرنا پڑتا ہے اور "مذہبی امور" کے لئے دوسری قسم کا (قمری) کیلنڈر ساری دنیا میں (غالباً) مسلمانوں کا کیلنڈر ہی ایسا ہے جو قمری بھی ہے اور اس میں لوند کا سال بھی نہیں آتا۔

باقی رہا چاند کی رُو سے مذہبی تیوہاروں کا تعین۔ سو اس کے لئے اگر چاند دیکھنے کی شرط کے بجائے حسابی قاعدہ سے چاند نکلنے کا تعین کر لیا جائے تو کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نہ تو شمسی کیلنڈر پر رضامند ہوگی اور نہ ہی حسابی قاعدے سے قمری کیلنڈر کے تعین پر۔ اس لئے کہ اس سے ان کی اجارہ داری ختم ہو جاتی ہے اور انہیں ابتری پھیلانے کا موقعہ نہیں ملتا۔ امت کے فکر و عمل میں وحدت مذہبی پیشوائیت کے لئے پیامِ مرگ ہوتی ہے۔

۲۔ قربانی کا جواز

سوال۔ یہ بات اب واضح ہو گئی ہے کہ عید کے موقعہ پر جو قربانی دی جاتی ہے اس کے لئے قرآن پاک میں کوئی حکم نہیں۔ اس سے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حضرات اس کے جواز میں کیا دلیل پیش کرتے ہیں؟ واضح رہے کہ عام مولوی صاحبان جو کچھ اپنے خطبوں اور وعظوں میں کہتے ہیں۔ اس کا مجھے علم ہے۔ میں دریافت یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اونچے پایہ کے علماء حضرات اس کے لئے کیا دلیل پیش کرتے ہیں۔؟

جواب۔ اس وقت ہمارے ہاں "اونچے پایہ کے علماء حضرات" کی صف میں جماعت اسلامی اپنے آپ کو پیش پیش رکھتی ہے۔ اس جماعت کی طرف سے قربانی کے جواز میں جو دلیل پیش کی جاتی ہے۔ اس کے لئے آپ اس جماعت کی کراچی کی شاخ کے امیر کا وہ بیان ملاحظہ فرمائیے جو ان کے ترجمان "التبیان" کی ۲۳ اپریل کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہم اللہ تعالیٰ کا بہ صمیم قلب شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہماری حقیر سی مساعی میں برکت

عطا فرمائی۔ اور مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود گزشتہ سال (۹۷۷۸) کے مقابلہ میں اس سال ۳۵۵۵ کھالیں زیادہ دلوائیں۔ کل ۱۳۲۲۳ کھالیں وصول ہوئیں۔ ہماری یہ کامیابی اللہ تعالیٰ کے فضل کے بعد اہالیان کراچی کے بھرپور تعاون اور ہمارے کارکنوں کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں جماعت اسلامی کی طرف سے اہالیان کراچی کے اس تعاون اور اعتماد پر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور یقین دلاتا ہوں کہ جماعت ان کے اس اعتماد کو کوئی ٹھیس نہ پہنچنے دے گی۔ میں جماعت کے کارکنوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جنہوں نے اپنی عید کی خوشی اور اپنے راحت و آرام کو قربان کر کے پوری جانفشانی اور محنت سے اس کام کو انجام دیا۔ خدا کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بندگانِ خدا کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق و صلاحیت عطا فرمائے۔ آمین!"

کہتے ہیں کہ اس سال کھالیں، پچیس پچیس، تیس تیس روپے میں بکی ہیں۔ اگر کم از کم قیمت بیس روپے بھی سمجھ لی جائے تو ایک شہر کراچی سے 'ایک جماعت کے حصے میں' اڑھائی لاکھ روپے سے زیادہ رقم آگئی۔ اس سے آپ پورے پاکستان — بلکہ سارے اسلامی ممالک کا اندازہ لگائیے۔ کہ ان حضرات کو کس قدر خطیر رقم مل گئی۔

کیا اس سے بڑھ کر محکم دلیل کوئی اور بھی ہو سکتی ہے۔؟

اسی سال کسی نے تجویز پیش کی تھی کہ ہمارے بارڈر کے اجڑے ہوئے لوگ جو دوبارہ بسائے جا رہے ہیں اور جن کے پاس نہ کھانے کو روٹی ہے نہ پہننے کو کپڑا۔ نہ سردی گرمی سے بچنے کے لئے چھت — نہ کھیتی باڑی کے لئے مال مویشی یا دوسرا سامان ہے، امسال عید کے جانور، ان لوگوں کو (زندہ) دے دیئے جائیں۔ اس سے ان کے اجڑے ہوئے کاشانوں میں زندگی عود کر آئے گی۔ لیکن "مسئلہ" یہ بیان کر دیا گیا کہ قربانی کے جانور کا خون بہانا ضروری ہے۔ اس لئے انہیں زندہ کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔

اور اس "مسئلہ" کی علت واضح ہے کہ کھال تو اسی صورت میں مل سکتی ہے جب جانور کا خون بہایا جائے ؎

خدا ایں سخت جاں را یاد بادا
کہ افتاد است از بام بلندے

۳۔ شاید کہ تیرے دل میں اُتر جائے میری بات!

ایک دردمند دل سے نکلی ہوئی تجویز پر غور فرمایئے ۔

"(لاہور میں) مال روڈ کے مرکزی مقام ریگل چوک پر ایک قطعہ زمین خالی پڑا ہے۔ اس قطعۂ زمین کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگایئے کہ اس سے ملحقہ رقبے چار چار لاکھ روپیہ فی کنال کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ اس قطعۂ زمین پر شہداء کی یاد میں، لاکھوں روپے کے صرفہ سے ایک عالیشان مسجد بنانے کی تجویز ہے۔

میں خدا کے فضل سے خود نماز پڑھتا ہوں۔ مسجد کا احترام میرے دل میں ہے۔ لیکن ہر بات کے لئے ایک موقعہ اور محل ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اگر اس قطعۂ زمین پر اسی صرفہ سے ایک کمرشل بلڈنگ بنا دی جائے۔ تو وہ، اس کے جائے وقوع کے اعتبار سے، بڑی اہمیت کی عمارت ہوگی جس سے ہزاروں روپے ماہوار کی آمدنی ہو سکے گی۔ اس آمدنی کو سابقہ جنگ کے شہداء کے بچوں، نیز دیگر فوجیوں کے مستحق بچوں کی اعلےٰ تعلیم کے لئے وقف کر دیا جائے۔ میرے خیال میں یہ شہداء کی بہترین یادگار ہوگی کیا آپ میری اس آواز کو ایسے مقام تک پہنچا سکیں گے جہاں اس کا کچھ اثر لیا جائے۔"

طلوعِ اسلام ـــــ طلوعِ اسلام کے ذریعے یہ آواز تو دور دور تک جا پہنچے گی۔ باقی رہا یہ کہ اس کا اثر بھی لیا جائے، سو اس کے لئے آپ بھی دعا کیجئے، ہم بھی دعا کرتے ہیں۔

۴۔ قرآن کریم کی ایک آیت کا مفہوم

سوال :۔ سورۂ طور میں ایک آیت ہے۔ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ (۵۲/۳۸)۔ اس کا ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ اور دیگر حضرات کرتے ہیں "کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر یہ سن آتے ہیں"۔ یعنے جس پر چڑھ کر یہ لوگ آسمانوں کی باتیں سن لیتے ہیں۔ اس سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ قرآن شریف آسمان کو کوئی محسوس مکان قرار دیتا ہے جہاں تک سیڑھی کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے فرعون نے تو استہزاءً اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ ایک اونچا سا مینارہ بنا دو جس پر چڑھ کر میں آسمان پر موسےٰ کے خدا کو جھانک آؤں۔ لیکن قرآن کریم نے ایسی بات کیوں کہی ہے ـــــ چونکہ مفہوم القرآن کا ستائیسواں پارہ ابھی تک چھپا نہیں اس لئے اس آیت کے مفہوم سے بذریعہ

طلوع اسلام مطلع فرمادیں تاکہ اور حضرات بھی مستفید ہوسکیں۔

جواب: اس آیت میں کسی لکڑی یا بانس کی سیڑھی کا ذکر نہیں جس کے ذریعے آسمان پر پہنچا جائے۔ یہ ایک عظیم حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ اوپر سے سلسلۂ کلام وحی کے متعلق چلا آرہا ہے۔ وحی کے سلسلہ میں قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس امر کی وضاحت کردی ہے کہ یہ ایک خارجی حقیقت ہے جسے "قلبِ نبوی پر" نازل "کیا گیا تھا۔" نزول "کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ یہ علم خارج سے آتا ہے۔ اس میں انسان کے اپنے فکر و خیال اور جذبات و عواطف کا دخل نہیں ہوتا۔ دوسری بات قرآن کریم نے یہ بتائی ہے کہ صاحبِ وحی کو اسے اپنی محنت اور کاوش سے حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتا ہے۔ انسان کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے وہ اس سرچشمۂ علم تک رسائی حاصل کرسکے۔ کوئی سیڑھی ایسی نہیں جس پر چڑھ کر وہ اس مقام تک جا پہنچے۔ وحی کا سلسلہ نبی اکرم کی ذات گرامی پر پہنچ کر ختم ہوگیا۔ لہٰذا اب خدا سے براہِ راست علم حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ (مسلّمٌ کے معنے ذریعے کے ہیں) خدا نے اس کی نفی کی ہے۔

لیکن ہمارے ہاں اس امر کے مدعی چلے آرہے ہیں، اور اب بھی ہیں، کہ ان کے پاس ایسی ایسی سیڑھیاں موجود ہیں جن کے ذریعے یہ سرچشمۂ علم الٰہی تک پہنچ سکتے (بلکہ پہنچ جاتے ہیں) یہ "سیڑھیاں" ہیں وہ چلے اور ریاضتیں جن کے ذریعے (ان حضرات کے دعاوی کے مطابق) انہیں کشف و الہام ہوتا ہے ـــــ زمانۂ جاہلیت میں اس قسم کی "سیڑھیوں" کے مدعی موجود تھے ـ جنہیں کاہن وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اور جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اگر وہ اس سرچشمۂ علم کیطرف آنے کی کوشش کریں تو انہیں آتشیں کوڑے پڑتے ہیں۔ قرآن کریم تو ان سیڑھیوں کے مدعیوں کے متعلق یہ کچھ کہتا ہے اور ہمارے ہاں ان کے مدعیوں کو مقربینِ بارگاہِ خداوندی قرار دیا جاتا ہے۔ یا للعجب۔

پھر قرآن کریم نے (دورِ جاہلیت کے ان مدعیان سے) کہا تھا۔ کہ وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل و برہان پیش کریں (فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ۔) ـــــ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ اس دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش نہیں کرسکیں گے ـــــ!

یہی حال ہمارے ہاں کے کشف و الہام کے مدعیوں کا ہے۔ ان سے بھی اس کی دلیل مانگیے تو یہ دلیل مانگنے والے کے پیچھے لٹھ لیکر دوڑتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ؎

؎ کارِ پاکان را قیاس از خود مگیر
گرچه ماند در نوشتن شیر و شیر

کار راستند لالیاں چوبیں بود
کارِ چوبیں سخت بے تمکیں بود

علم و بصیرت اور دلیل و برہان کے خلاف ان حضرات کی جنگ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ جیسے ہمارے ہاں بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے اور جھوم جھوم کر کہا جاتا ہے کہ ؎

ذوقِ ایں بادہ نہ دانی، بخدا تا نہ چشی

"نشہ کو دلیل سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اسے تو وہی جانے جو خود پیئے"

کسان کی بے بسی

ایک خط: "میں یہ خط گاؤں سے لکھ رہا ہوں۔ کسانوں نے رات دن ایک کر کے چھ ماہ کی محنت شاقہ کے بعد گیہوں کی فصل تیار کی۔ فصل پکی۔ کسانوں کے گھروں میں مسرت کی لہریں دوڑ گئیں کہ اب چند دنوں کے بعد ان کی کوٹھیاں اناج سے بھر جائیں گی۔ وہ سال بھر کا قرضہ چکائیں گے۔ آئندہ سال کے لئے روٹی کی فکر سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ کئی رُکے ہوئے کارج کریں گے۔ انہی جذبات کو سینوں میں لئے ہوئے کسانوں نے گیہوں کاٹی، دھوپ کڑاکے کی تھی۔ انہیں اس کی ضرورت تھی۔ چٹیل میدانوں میں گیہوں گاہنے کے لئے ڈال دی۔ سارا سارا دن اس چلچلاتی دھوپ میں انہوں نے اور ان کے بے زبان مویشیوں نے لہو پسینہ ایک کر کے اسے گاہا۔ اب اسے اڑا کر دانہ اور بھوسہ الگ کرنا باقی تھا کہ رات اچانک کالی گھٹا اٹھی۔ آدھی رات سے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پکی پکائی فصل پانی کی نذر ہو گئی۔ کسان حسرت بھری نگاہوں سے اپنی اجڑتی ہوئی دنیا کو دیکھ رہے تھے۔ اور کچھ کر نہیں سکتے۔ ان کی بے بسی اور بے کسی قابلِ رحم ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ انہوں نے اللہ میاں کا کیا بگاڑا تھا جو اس نے انہیں اس طرح تباہ کر دیا۔ مولوی صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ سب تمہارے گناہوں کی سزا ہے۔ اللہ میاں کسی پر ظلم زیادتی نہیں کیا کرتے۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ گنہگار تو ہم سے بھی بڑھ کر کئی ہیں۔ ان کا تو بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ گناہوں کا وبال ہم پر ہی کیوں پڑ رہا ہے جو کئی سالوں سے ہمارے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔؟ — فرمائیے میں انہیں کیا جواب دوں؟

طلوع اسلام

کسانوں کی بے بسی، آپ کی حیرت، اور ملا کی جہالت، سب اپنے مقام

پر ٹھیک ہے۔ بادل، ہوائیں، دھوپ، سردی گرمی۔ وہ "ملائکہ" ہیں جن کے متعلق ہمیں کہا گیا ہے۔ کہ وہ "آدم" (یعنی آدمی) کے سامنے سجدہ ریز ہوں گے۔ جب "ابن آدم" (یعنی زمانہ قدیم کا انسان) ہنوز مقامِ آدم تک نہیں پہنچا تھا وہ ان ملائکہ کو اپنے سامنے جھکا نہیں سکا تھا۔ وہ ان سے ڈرتا، کانپتا تھا۔ جوں جوں وہ "آدم" بنتا گیا، فطرت کی قوتیں اس کے تابع تسخیر ہوتی چلی گئیں۔ ہماری بے بسی کی وجہ یہ ہے کہ ہم مقامِ آدم تک نہیں پہنچ سکے۔

ہمارے ہاں فصلوں کے بونے اور کاٹنے کا پروگرام نہ معلوم کتنے ہزار سال پہلے متعین ہوا تھا۔ یہ مقرر ہوا تھا اُس زمانے کے موسموں کے مطابق ــــ اب موسموں میں تغیر آ چکا ہے، لیکن ہمارے ہاں فصلوں کا پروگرام ابھی تک وہی چلا آ رہا ہے۔ یہ فریضہ قوم کے اربابِ فکر و دانش کا تھا، کہ وہ ان موسمی تغیرات کا جائزہ لے کر فصلوں کے لئے ایک نیا پروگرام مرتب کرتے اور کسانوں کو اس کے مطابق ہدایت کرتے۔ لیکن انہوں نے یہ نہ کیا۔

زندہ قوموں نے یہ بھی کیا اور اس کے ساتھ ہی ایسی ایسی مشینیں بھی ایجاد کر لیں جن سے ہفتوں کے کام گھنٹوں میں سرانجام پا جائیں۔ مثلاً انہوں نے (HARVESTER) تیار کر لئے ہیں۔ ایک مشین پورے گاؤں کی کھڑی فصل کو کاٹ کر ــ گاہ کر ــ دانہ کو بھوسے سے الگ کر کے ــ بوریاں بھر کر تیار کر دیتی ہے۔ اور یہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ ایک دن میں ہو جاتا ہے۔ وہاں پورے گاؤں کی کاشت کو اپ ٹو ڈیٹ طریق سے ہوتی ہے، اس لئے ایک مشین، ایک دن میں سب کچھ کر کے اگلے دن دوسرے گاؤں پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح نہ کسانوں کی حسرت بھری نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف تکتی ہیں۔ نہ انہیں خدا کے خلاف کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ نہ ملا کو یہ فریب انگیز افیون پلانی پڑتی ہے کہ یہ سب تمہارے گناہوں کی سزا ہے اور نہ ہی آپ جیسوں کو کسی معقول جواب کی تلاش میں مارے مارے پھرنا پڑتا ہے۔

یہاں، نہ وہ ہوا، نہ یہ ــ اب ان کسانوں کو کون بتائے کہ انہیں کس کے گناہوں کی سزا بھگتنی پڑ رہی ہے؟ ایک بتانے والے نے البتہ اتنا بتایا تھا کہ ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب! (زبورِ عجم)

سو ہم نے اسے شاعر کا خواب کہہ کر اَن سنی کر دیا

حقائق و عبر

حاجی اور نمازی

روزنامہ "مشرق" (لاہور) کے عید نمبر میں خانہ کعبہ کی ایک تصویر شائع ہوئی تھی جس کے نیچے لکھا تھا۔

"یوم عرفہ کو خانہ کعبہ کا غلاف بدل کر اونچا کر دیا گیا ہے تاکہ کوئی اسے کاٹ نہ سکے"

یعنے مسجدوں میں نمازی جوتے چور اور خانۂ کعبہ میں حاجی غلاف تراش! جب دین کے ارکان رسم بن کر رہ جائیں تو ان سے اسی قسم کا کردار وجود میں آتا ہے۔

اس کے نیچے ایک اور تصویر ہے جس پر لکھا ہے:۔

"ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو شیطان کو کنکریاں مارنے والوں کا ہجوم"

اگر انہیں شیطان کو کنکریاں مارنے کے بجائے، خود اپنے آپ کو کنکریاں مارنے کی تعلیم دی جائے تو پھر جوتی چوروں اور غلاف تراشوں کا وجود باقی نہ رہے۔

ہندوستان کے مسلمان

گزشتہ جنگ اور اس کے عواقب کے دوران، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے وہاں کے رسائل اور اخبارات بھی نہ ملتے رہے اور اسطرح معلوم نہ ہو سکا کہ اس عرصہ میں وہاں کے مسلمانوں پر کیا بیتی ہے۔ اب بعض رسائل آنے شروع ہوئے ہیں تو ان سے کچھ واقعات سامنے آرہے ہیں۔ اس سلسلہ میں دیوبند سے شائع ہونے والے ماہنامہ تذکرہ دسمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت

کے شذرات کی ابتدائی سطور ملاحظہ فرمائیے۔

"مسلم یونیورسٹی کی صد سالہ تاریخ ختم ہوئی اور اسے سکولرازم کے نام سے قومی بنا لیا گیا۔ اگرچہ سیکولر مسلمانوں کا ایک گروہ پیدا کیا جا رہا ہے مگر یونیورسٹی کو "سیکولر مسلم یونیورسٹی" کا نام نہیں دیا گیا۔ حکومت جس نام کے پیچھے مدتوں سے پڑی ہوئی تھی اور اسے اس نام کو کھرچنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس پر ایک مسلمان وزیر کے ہاتھوں فاتحہ پڑھوا دی گئی۔ شروع میں کہا گیا مسلم یونیورسٹی کے اسلامی کردار کو باقی رکھا جائے گا۔ مگر اس مسلمان وزیر کی زبان سے پارلیمنٹ میں اعلان کرایا گیا کہ اس کے اسلامی کردار کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ پھر کہا گیا کہ مسلم یونیورسٹی ایک قومی یونیورسٹی ہے مسلمانوں کی یونیورسٹی نہیں ہے۔ ساتھ ہی اعلان کیا گیا کہ یہ یونیورسٹی سرکاری ہے، سرکار کے خرچ سے چلتی ہے۔ اسے سرسید مرحوم کی طرف منسوب کرنا غلط ہے۔"

اس کے بعد لکھا ہے:-

"پاکستان سے کشیدگی بڑھ چکی تھی۔ حکومتِ ہند کے لئے ضروری تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی دلداری کرتی اور انہیں اپنی ہمدردی اور خیر سگالی کا یقین دلاتی مگر اس نے عین دلداری کے وقت ان کی دل آزاری کا سامان کیا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ خواہ حالات کتنے ہی نازک ہو جائیں حکومت کو مسلمانوں کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں۔ وہ سکھوں کے مطالبہ پر غور کر سکتی ہے اس نے سکھوں کے سربراہ کی خوشامد کی اور پاکستان کا خطرہ دکھا کر انہیں مرن بھرت رکھنے سے باز رکھا اور جنگ بندی کے چند گھنٹے کے بعد ہی پنجابی صوبہ کا جائزہ لینے کے لئے دو کمیٹیاں بھی بنا دی گئیں۔ وہ سکھ لیڈروں کی کڑوی باتیں بڑی فراخ دلی سے سن رہے ہیں مگر مسلمانوں کی آنکھوں میں قہر آلود آنکھیں ڈال کر کہہ دیا گیا کہ مسلم یونیورسٹی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ قومی یونیورسٹی ہے۔ اسلامی کردار کو اگر ڈھونڈنا ہو تو کسی مسجد یا خانقاہ میں جا کر ڈھونڈو۔ مسلم یونیورسٹی میں اس کی تلاش مت کرو۔"

اسی رسالہ میں جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم عمومی ۔۔۔ مولانا سید اسعد صاحب مدنی ۔۔۔ کا ایک خط شائع ہوا ہے جو انہوں نے ہندوستان کے سابقہ وزیر اعظم، لال بہادری شاستری کے نام لکھا تھا۔ اس خط میں انہوں نے شاستری صاحب کی ایک تقریر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ اس تقریر سے آپ اندازہ لگائیے کہ ہندوستان کے اس قدر ذمہ دار اربابِ حل و عقد، مسئلہ کشمیر اور پاکستان کے مطالبہ کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مدنی صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

"محترم شاستری جی! — آداب!

میں نے اخباروں میں شائع شدہ آپ کی ایک تقریر پڑھی جس میں آپ نے اپنی پسی ہوئی کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ۔

پاکستان جو ہمیشہ اسلام کی اصطلاح میں سوچتا ہے اور وہ اس دھوکہ میں ہے کہ کشمیر کو وہ اس لئے ہڑپ کرلے گا کہ وہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے، یہ پاکستان کی خام خیالی ہے۔ ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمان بستے ہیں اگر پاکستان یہ سوچتا ہے کہ مسلم اکثریت کے بل پر کشمیر کو لے سکتا ہے تو اس صورت میں ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔"

یہ ہے اندازِ فکر وہاں کے ذمہ دار افراد کا۔ دوسری طرف، وہاں کے عام ہندوؤں کا زاویہ نگاہ کیا ہے اس کا اندازہ مولانا مدنی کے محولہ بالا خط کے ایک پیرے سے لگ سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"تعجب ہے کہ ایسے حالات میں جبکہ جن سنگھ اور دوسرے فرقہ وارانہ عناصر اپنے بیانوں تقریروں پمفلٹ کہ پٹنہ میں ایک کنونشن کرکے کھلے عام چھ کروڑ مسلمانوں کو ہندوستان سے نکالنے اور مٹانے کا اعلان کرتے ہیں اور وہ کسی طرح مسلمانوں کی خصوصیات یہاں تک کہ ان کے وجود کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور ان سے آئین و قانون کے خلاف اس طرح کے اعلانوں اور ہندوستان کے تئیں امن شہریوں کو چیلنج کرنے پر کوئی باز پرس نہیں کی گئی۔"

سوچئے کہ اگر پاکستان کی جداگانہ مملکت وجود میں نہ آتی، اور ہم سب ہندوں کے زیر حکومت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے تو ہمارا بھی وہاں کیا حشر ہوتا؟

بھارتی جمہوریت

ہندو ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں کہ ان کے ہاں صحیح جمہوریت رائج ہے۔ ذرا اس جمہوریت کا اندازہ اس خبر سے لگائیے جو اخبار "مدینہ" (بجنور) کی ۱۷ فروری ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

"بنگلور۔ ۱۳ فروری۔ میسور شہر کے اندر ایک ایسی سڑک ہے جس پر ہریجنوں کو جوتوں سمیت چلنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ انکشاف چھوت چھات روک تھام کرنے والی نوا رکانی کمیٹی

کے صدر مسٹرایل ایلے پریل نے اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا میں نے حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے اور امید ہے کہ یہ بدعت ختم کردی جائے گی۔

کمیٹی کے ارکان نے ریاست کا دورہ کیا اور انہیں معلوم ہوا کہ پرانے میسور کے کچھ حصوں میں ابھی تک جیتھا سسٹم جاری ہے یعنی کچھ لوگوں سے غلاموں کی طرح کام لیا جاتا ہے۔ (ناقلین)

یہ ہے ہندی جمہوریت کا نمونہ! آپ کو شاید اس کا علم ہوگا کہ ہریجن خواہ کچھ بھی ہوں، ہندو بہرحال ان کا شمار اپنوں (ہندوؤں) میں کرتے ہیں لیکن مسلمانوں کو وہ ملیکش سمجھتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ جب وہاں خود ہندوؤں کے اپنے ایک طبقہ کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہے تو بیچارے ملیکشوں پر وہاں کیا نہ گزرتی ہوگی؛

کتنا بڑا احسان ہے ہم پر اس مردِ جلیل' قائداعظمؒ کا جس نے ہمیں اس قسم کی قوم کی ذلت آمیز محکومی سے بچا لیا! اور اس کے بعد کس قدر گراں مایہ خدمت ہے ہماری افواج کی جنہوں نے حالیہ جنگ میں اپنا خون دے کر ہماری اس آزادی کو محفوظ رکھا۔ اللہ اس خطۂ زمین کو، جو ہمارے لئے اس قسم کے رسوا کن ہمسایہ کے ذلت آمیز سلوک سے بچنے کے لئے محفوظ قلعہ ہے، ہر آفت سے بچائے رکھے۔

پختہ تر گردد مزاجِ خانقاہی میں اسے

روزنامہ مشرق (لاہور) کی اشاعت بابت ۲۴ اپریل ۱۹۶۶ء میں حضرت بابا فریدالدین مسعودؒ گنج شکرؒ کے حالاتِ زندگی میں لکھا ہے۔

آپ تمام دن مسجد میں عبادت کرتے اور سرِ شام ہی مسجد کے ایک خدمتگار رشیدالدین مینائی کی مدد سے رسے کے ایک سرے کو اپنے پاؤں سے باندھ کر کنوئیں میں الٹے لٹک جاتے اور رشید مینائی رسے کا دوسرا سرا لمبی شاخوں والے درخت کی ایک ٹہنی .... سے باندھ دیتے جو کنوئیں پر چھتری ڈالے ہوئے تھا۔ صبح ہوتی تو مینائی انہیں باہر نکال لیتے۔ چالیس دن کے اس عمل نے آپ پر کمزوری کی کیفیت طاری کردی۔ ناچار آپ نے چھڑی کا سہارا لے کے چلنا شروع کردیا۔ ندائے غیبی آئی" اب ہمارا سہارا چھوڑ کر غیر کے سہارے پر اتر آئے ہو" فوراً چھڑی پھینک کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔

آگے چل کر لکھا ہے :-

" آپ کو شکر گنج کہا جاتا ہے۔ اس کی توجیہہ میں کئی روایات ملتی ہیں۔ یہاں دو روایات درج کی جاتی ہیں۔

اوّل :- آپ جنگل میں عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک دوپہر پیاس کی شدت بڑھی تو آپ نے ایک کنواں تلاش کیا۔ کنوئیں میں جھانکنے سے معلوم ہوا کہ پانی زیادہ گہرا ہے اور بغیر مشکیزے اور ڈور کے کام نہیں بن سکتا۔ آپ یہی سوچ رہے تھے کہ اس اثنا میں دو ہرن ادھر آ نکلے جب وہ کنوئیں کی منڈیر پر آئے تو پانی قدرت الٰہی سے کناروں تک اچھل پڑا۔ جانوروں نے پانی پیا اور چلے گئے۔ آپ نے یہ تماشا دیکھا اور خود بھی پینے کے لئے بڑھے کہ پانی اپنی اصل جگہ پر پہنچ گیا۔ بڑے حیران ہوئے۔ غیب سے ندا آئی " تم نے مشکیزے اور ڈوری پر بھروسہ کیا ہوا ہے، جانور میرے بھروسے پر آئے۔ سو میں نے انہیں پانی پلا دیا۔" آپ ندامت کے ساتھ واپس تشریف لائے۔ اور چالیس روز تک چلہ کشی کی۔ چالیسویں روز بھوک پیاس نے ستایا، تو زمین سے چند کنکر اٹھا کر منہ میں رکھ لئے۔ کنکر منہ میں رکھتے ہی وہ شکر میں تبدیل ہو گئے۔

دوم :- آپ کی والدہ بچپن میں آپ کے جانماز کے نیچے آپ سے چھپا کر شکر کی چند ڈلیاں رکھ دیتیں ایک روز وہ شکر رکھنا بھول گئیں۔ آپ نے جانماز پر نماز پڑھی اور بعد میں حسب معمول جانماز کا کونہ اٹھایا تو نیچے شکر پائی۔ ماں حیران رہ گئیں اور بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہو گئیں۔

جس کا یہ تصوف ہو — وہ اسلام کر ایجاد

اسی اخبار کے یکم مئی کے ایڈیشن میں حضرت سلطان باھوؒ کے متعلق حسب ذیل واقعات شائع ہوئے ہیں :-

آپ پیدائشی ولی تھے۔ رمضان المبارک میں سحری سے لیکر شام تک والدہ کا دودھ نہیں پیا کرتے تھے — آپ نے حصول معاش کی خاطر کوئی دنیاوی شغل اختیار نہیں کیا تھا۔ آپ نے دو مرتبہ بیل خرید کر کھیتی باڑی شروع کی لیکن ابھی فصل پکنے نہ پائی تھی کہ آپ اسی حالت میں سب کچھ چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ فاقہ کی رات فقیر کے لئے معراج کی رات ہوتی ہے۔ جس رات اسے اللہ تعالیٰ کا وصال ہوتا ہے۔

اور سنیئے ۔ ۲۰ مئی کے اخبار پاکستان ٹائمز میں ایک تصویر شائع ہوئی ہے جس کے نیچے لکھا ہے کہ میجر غلام قادر صاحب وزیر مغربی پاکستان، داتا صاحب کے دربار (یعنی مزار) کو غسل دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک خبر شائع ہوئی ہے جس میں اس غسل کی تفصیل دی گئی ہے اور لکھا گیا ہے کہ اس غسل کے وقت محکمہ اوقاف کے چیف اڈمنسٹریٹر صاحب بہ نفس نفیس موجود تھے۔ اور اس محکمہ کی طرف سے غسل کے بعد لنگر تقسیم کیا گیا۔

کیا اس کے بعد بھی آپ کہیں گے کہ یہاں اسلامی حکومت قائم نہیں؟

بڑے میاں ......

یہ اصحاب طریقت کی باتیں تھیں۔ اب ارباب شریعت کی سنیئے۔ ہفت روزہ توحید (لاہور) جماعت اہل حدیث کا ترجمان ہے۔ یہ جماعت بدعتیں مٹانے اور اسلام سے توہمات ختم کرنے کی مدعی ہے۔ اس جریدہ کی ۲۲ اپریل ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں حضور نبی اکرمؐ کی ذات اقدس و اعظم کے متعلق لکھا ہے:۔

مدینہ کے یہودیوں نے آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر کئی دفعہ جادو کیا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بالآخر انہوں نے ایک ماہر جادوگر کی خدمات حاصل کیں حافظ صاحب نے فتح الباری میں اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے۔

جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ماہ ذوالحجہ میں حدیبیہ سے واپس تشریف لائے اور محرم سے ۷ھ کا آغاز ہوا تو سرکردہ یہودی ایک جادوگر لبید بن اعصم کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے:۔

یا ابا الاعصم انت اسحرنا وقد سحرنا محمدا فلم نصنع شیئا ونحن نجعل لک جعلا علی انہ تسحرہ سحرا ینکوہ فجعلوا لہ ثلثۃ دنانیر

ترجمہ:۔ اے ابوالاعصم! ہم نے محمدؐ پر جادو کیا ہے لیکن کامیاب نہیں ہو سکے تم جادو میں ہم سب سے زیادہ ماہر ہو اس لئے اس پر کوئی مہلک جادو کرو۔ ہم آپ کا حق الخدمت ادا کئے دیتے ہیں۔ راوی کا بیان ہے اس کام کے لئے انہوں نے اس کو تین اشرفی معاوضہ دیا؛

حافظ صاحب لکھتے ہیں :-

لبید نے موم لے کر آپ کا مجسمہ بنایا۔ اس میں جگہ جگہ سوئیاں گاڑ دیں۔ پھر ایک تانت لیکر اس میں گیارہ گرہیں لگائیں اور جادو پھونک کر اس پتلے پر لپیٹ دی۔ صحیح بخاری میں آتا ہے کہ اس نے کسی طرح آپ کے سر کے بال حاصل کئے۔ ان کو کنگھی کے دانوں میں پھنسا کر جادو کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ دونوں طریقے استعمال کئے اور جادو کا عمل مکمل کرنے کے بعد کھجور کے گابھے کے چھلکے میں رکھ کر غیر آباد کنوئیں ذی اروان کی تہ میں چھپا دیا۔

اس کے بعد جوں جوں دن گذرتے گئے۔ آپ کی طبیعت بگڑنے لگی اور آپ پر بیماری کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ آپ کی بصارت پر بھی اثر پڑا۔ کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات میں بھی فرق آگیا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں :-

مَرِضَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ واخذ عن النساء والطعام والشراب — (فتح الباری ۲۳۵/۱۲)

عَنْ عَائِشَۃَ حَتّٰی اَنْکَرَ بَصَرَہٗ — (حوالہ مذکور)

کم و بیش آپ چھ مہینے تک متاثر رہے۔ جب تکلیف بڑھنے لگی تو ایک رات آپ نے اللہ تعالیٰ سے بار بار دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خواب میں فرشتوں کی معرفت جادو کی خبر بتا دی چنانچہ آپ دوسرے دن صحابہؓ کی ایک جماعت لے کر کنوئیں پر گئے۔ اس کی تہ سے جادو شدہ پتلا اور کنگھی نکالی۔ آپ معوذتین پڑھتے جاتے تھے اور تانت سے گرہیں کھولتے اور پتلے سے سوئیاں نکالتے جاتے تھے۔ جب سوئی نکالتے، تو آپ کو تکلیف محسوس ہوتی لیکن اس کے بعد فوراً آرام آجاتا۔ حتیٰ کہ جب آپ نے وہ تمام عمل باطل کر دیا تو فی الفور آپ کے تمام عوارض دور ہو گئے۔

حَتّٰی قَامَ کَاَنَّمَا نُشِطَ مِنْ عِقَالٍ —

"جیسے کوئی آدمی رسیوں میں بندھا ہوا ہو اور اس کی رسیاں کھول دی جائیں۔"

قرآن کریم میں ہے کہ مخالفین (کفار اور مشرکین) حضورؐ کے خلاف مختلف قسم کے بہتان تراشتے، کبھی آپ کو کاہن کہتے کبھی شاعر۔ کبھی مجنون کہتے کبھی مسحور — سورۂ فرقان میں ہے :-

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۔ اُنْظُرْ کَیْفَ ضَرَبُوْا لَکَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا ۔ (۲۵/۸-۹)

اور یہ ظالم (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم ایک ایسے شخص کا اتباع کرتے ہو جس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ دیکھو! یہ تمہارے خلاف کس کس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ گمراہ ہو چکے ہیں اور اب (صحیح) راستہ پا نہیں سکتے۔

یعنی کفار اور مشرکین حضورؐ کے خلاف یہ بہتان بھی تراشتے کہ آپؐ پر (معاذ اللہ) کسی نے جادو کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی تردید کرتا کہ یہ لوگ بکتے ہیں اور گمراہ ہو چکے ہیں۔

اور یہ ہمارے حامیانِ دینِ متین ہیں کہ بخاری شریف کے حوالے اور فتح الباری کی تائید کیساتھ دھڑلے سے، خم ٹھونک کر کہتے ہیں کہ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ آپ پر جادو کیا گیا تھا اور اس کا آپؐ پر اثر بھی ہوا تھا یعنی آپؐ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) "رجل مسحور" تھے۔

غور فرمایا آپ نے کہ یہ حضرات خدا اور اس کے رسولؐ کے متعلق کس قسم کا تصور پیش کرتے ہیں؟ اور اگر کسی کی غیرتِ ایمانی اسے گوارا نہ کرے کہ وہ اپنے رسولِ مقبولؐ کی شانِ اقدس کے خلاف اس قسم کی باتوں کو سچا سمجھے۔ (بالخصوص جب خود خدا اس کی تردید کر رہا ہو) اور کہہ دے کہ اس قسم کی روایات وضعی ہیں، تو اسے منکرِ حدیث قرار دے کر ملحد و مرتد (اور نہ جانے کیا کچھ) قرار دے دیا جائے۔!

حقیقت یہ ہے کہ:-

از باغباں شداست کہ صیاد آں نہ کرد

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور	۲۵۔ بی۔ گلبرگ ۲	ہر اتوار کی صبح ۸ بجے
کراچی	سندھ اسمبلی ہال۔ بندر روڈ	ہر اتوار کی صبح ½۹ بجے
لائلپور	پنجاب ڈیریز (۸۰-بی) پیپلز کالونی	ہر جمعہ کی شب۔ بعد نماز عشاء
لیہ	مغل ہوٹل (نزد ریلوے اسٹیشن)	ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ
ملتان	میسرز شاہ محمد اینڈ سنز، بیرون پاک دروازہ۔	ہر جمعہ کو، بعد نماز جمعہ

علاوہ بریں ——— یہ درس راولپنڈی۔ سرگودھا۔ سید حسن میں بھی جاری ہے۔

——— مقام اور وقت کے متعلق مقامی بزم کے نمائندہ سے دریافت فرمالیں ———

انگلستان میں ——— یہ درس بزم طلوع اسلام، بریڈ فورڈ کے زیر اہتمام نشر ہوتا ہے۔

محترم محمد اسلام
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی

تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف

(طلوعِ اسلام کنونشن میں تقریر)

خواتین وحضرات!

ہمارے ان سالانہ اجتماعات کا آغاز ہوئے نو سال سے زیادہ مدت ہو گئی۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں یہاں ہماری پہلی کنونشن ہوئی اور اس کے بعد آج تک یہ سلسلہ باقاعدگی سے سرانجام پاتے چلا آرہا ہے۔ سالانہ اجتماعات کی اس تقریب پر ہم طلوعِ اسلام کی قرآنی تحریک کو آگے بڑھانے اور اس کے سلسلۂ اشاعت کو بیش از بیش موثر بنانے کی تجاویز پر غور بھی کرتے ہیں اور مزید براں میر کارواں اور ان کے رفقائے سفر کے خطابات اور مقالات سے قرآنی تعلیمات کے اہم سے اہم گوشوں کی نقاب کشائی کا فریضہ بھی تکمیل پاتا ہے۔

لیکن جہاں یہ سب کچھ حسن کارانہ انداز سے سرانجام پاتا چلا جاتا ہے وہاں اس کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جو شاید اب تک کماحقہٗ سامنے نہیں آسکا اور وہ ہے خود اس تحریکِ فکرِ قرآنی کا اپنا تعارف۔ یعنی اس حقیقت کشا اور بصیرت افروز تحریک کا آغاز کب اور کیونکر ہوا۔ ہماری حیاتِ ملی کے وہ کون سے تقاضے تھے جن کی بجا آوری کی خاطر مفکرِ قرآن نے اپنی زندگی وقف کی۔ پھر آہستہ آہستہ ان کے رازداں اور ہم فکر پیدا ہوئے اور اس طرح قرآن کے ایک عظیم مفکر کی آواز ہزاروں دلوں کی آواز بن گئی۔ فکرِ قرآنی کی یہ شمعِ نورانی ایک کمرے کی فضا میں محدود نہ رہی بلکہ اس کی روشنی سے اس برصغیر کے کئی ایک در و دیوار اور کئی ایک گوشے جگمگائے اور آج یہ روشنی پاکستان کی چار دیواری سے آگے بڑھ کر بیرونِ پاکستان کی بڑی بڑی علمی بارگاہوں تک پہنچ چکی ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ اپریل ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام پہلی بار ایک جریدہ کی حیثیت سے منظرِ اشاعت پر آیا۔ یہ وہ نازک مرحلہ تھا جب قائدِ اعظمؒ نے انگلستان سے واپس پہنچ کر سفینۂ ملت

کی ناخدائی کا نازک فریضہ اپنے ذمہ لیا تھا۔ ملّتِ اسلامیہ کی یہ کشتی ہر چہار اطراف سے طوفانوں میں گھری ہوئی تھی۔ کشتی کے مسافر پریشانیٔ فکر و نظر کے شکار تھے۔ آزادی اور جمہوریت کے پردے میں ہندو قوم کانگرس کے جھنڈے تلے اپنی صفوں کو منظم کر چکی تھی۔ مسلمانوں کے چوٹی کے مذہبی پیشوا وارد ھا آشرم اور آنند بھون کے آستانوں کا طواف کر رہے تھے۔ منظم ہندو کی اکثریت کروڑوں مسلمانوں کی منتشر اقلیت کو اپنی ابدی غلامی کے دام تزویر میں جکڑنے کے منصوبے مکمل کر چکی تھی اور وہ وقت قریب تھا جب ہماری احساسِ خودی سے بیگانگی اور بے نصیبی ہمارے قومی وجود اور ملّی تشخص کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے رکھ دے اور ہم ہمیشہ کے لئے ہندو سامراج کی بدترین غلامی اور محکومی کے شکنجوں میں ملیامیٹ ہو کر رہ جائیں۔

اس سانحۂ قیامت میں جب قائداعظم مرحوم و مغفور مسلمانوں کی سیاسی قیادت کے لئے میدان میں اترے اور انہوں نے تسبیح کے ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک سلکِ تنظیم میں پرونے کا کام سنبھالا تو ان کی راہ میں مشکلات و موانعات کے پہاڑ سر اٹھائے کھڑے تھے۔ وہ بساطِ سیاست پر اپنے مدِمقابل کے مہروں کو مات دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے تدبر اور فراست نے دشمنوں پر ایک تہلکہ سا ضرور بٹھا دیا تھا لیکن ایک محاذ ایسا بھی تھا جو قائداعظمؒ کے بس کا نہ تھا۔ یہ محاذ تھا ان مخالفین کی مدافعت کا جو قال اللہ اور قال الرسولؐ کے نقاب میں آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں معاملہ مذہبی پیشوائیت کے ان مہروں سے تھا جنہیں جبہ و دستار کے تقدس میں دشمن اپنا آلۂ کار بنا کر آگے بڑھ چکا تھا۔ اور یہ "مفتیانِ شرعِ مبین" خوفِ خدا اور تقاضائے ایمان و دین سے بے نیاز ہو کر یہ فتوے صادر فرما رہے تھے کہ وارد ھا آشرم کے مہاتما اور آنند بھون کے پنڈت بروئے شریعت ہمارے سیاسی امام قرار پا سکتے ہیں کیونکہ سیاست کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام ہمارا پرائیویٹ معاملہ ہے اور ملکی سیاسیات اور آزادی کی جدوجہد ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر مشتمل متحدہ قومیت کا مسئلہ!

اندازہ لگائیے کہ اس محاذ پر قائداعظمؒ کو کس مضبوط دست و بازو کی ضرورت تھی۔ جبہ و دستار میں لپٹے ہوئے یہ لات و منات جنہیں دشمنوں نے مقدمۃ الجیش بنا کر آگے بڑھایا تھا .... بمنبرِ رسولؐ پر کھڑے ہو کر نعرہ بلند کر رہے تھے کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" ملّت کے قلبِ حساس علامہ اقبالؒ نے بسترِ مرگ پر یہ آواز سنی تو وہ تڑپ اٹھے اور اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے۔

ہماری تاریخ کا یہی وہ نازک مرحلہ تھا جہاں تحریکِ قرآنی کے داعی محترم پرویز صاحب قائداعظمؒ کی مدد کے لئے آگے بڑھے اور طلوعِ اسلام فکرِ قرآنی کی شمعِ رخشندہ کو تھامے ہوئے معرکۂ دین و وطن کی رزمگاہ میں جلوہ بار ہوا۔ اور وارد ھا کے ساحری نے جو رسیاں سانپ بنا کر آگے بڑھائی تھیں انہیں قرآنی

دلائل و براہینِ قاطعہ کے عصائے کلیمی سے زیر و زبر کرتا چلا گیا۔ یہ پیرو تبزا در اس کا طلوعِ اسلام تھا جس نے شیخ الہند کے نعرۂ وطنیت کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے اور ملتِ اسلامیہ کے دل و دماغ پر یہ قرآنی حقیقت نقش کی کہ ہماری ملت کی اساس صرف دین و ایمان کی بنائے اشتراک ہے۔ وطن کا سومنات مسلمانوں کی قومیت کی اساس نہیں بن سکتا۔

اگلا مرحلہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر نازک تر تھا۔ اور وہ تھا مشترکہ تعلیم و تربیت کے ذریعے کانگریس کے زیرِ اقتدار صوبوں میں مسلمانوں کی نئی نسل کو قابو میں لانا۔ اس ابلیسی سازش کے تحت واردھا اسکیم کے نام پر نیا نصابِ تعلیم مرتب کیا گیا جس کا مقصد ملت کے شاہین بچوں سے ان کی متاعِ دین و ایمان چھین لینے کے سوا اور کچھ نہ تھا اس سازش کا سرچشمہ گاندھی جی کا دل و دماغ اور واردھا کا آشرم تھا لیکن دنیا کو مبتلائے فریب کرنے کے لئے اس نصابِ تعلیم کی تربیت و تکمیل ایک مسلمان ماہرِ تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام پر عمل میں لائی گئی تھی۔

اس نازک موڑ پر طلوعِ اسلام پھر قرآنی فکر و بصیرت کی قوتوں سے مسلح ہو کر میدان میں اترا اور ایک دنیا نے دیکھا کہ واردھا اسکیم کے پرزے فضائے آسمانی میں اڑ رہے ہیں۔ طلوعِ اسلام نے اس نصاب کا تجزیہ ایسے بصیرت آفریں انداز سے کیا کہ اس پُر فریب زریں نقاب کو اس حسین انداز سے تار تار کر کے رکھ دیا کہ اس کے پمفلٹس چھ مختلف زبانوں میں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئے۔ برصغیر کے گوشے گوشے تک پہنچے اور چند ہی دنوں میں اس سازش کا ایک ایک مکروہ گوشہ بے نقاب ہو کر منظرِ عام پر آ گیا اور واردھا کے سامری اور آنند بھون کے ہامان عرقِ ندامت سے شرابور پیشانیاں لئے دنیا کے سامنے گردنیں جھکائے کھڑے تھے۔ واردھا اسکیم کے تحت نصابِ تعلیم کی لاکھوں کتابیں خاموشی سے سمندر میں غرق کرنی پڑیں ڈھول کا پول کھل گیا۔ دشمن کی گھناؤنی سازش زیر و زبر ہو کر رہ گئی۔ مذہبی پیشوائیت کی اغیار پرست کٹھ پتلیاں بے نقاب ہو کر ملت کے سامنے آ گئیں۔ قوم کے وہ لاکھوں شاہین بچے جنہوں نے آگے چلکر تحریکِ پاکستان کے علمبردار اور ملت کے پاسبان بننا تھا اس میٹھے زہر (SLOW POISON) سے بال بال بچ گئے جو ان کے لئے انتہائی مکاری سے تیار کیا گیا تھا۔

یہ تھا تحریکِ پاکستان کا وہ خالص دینی محاذ جس پر اس نازک دور میں طلوعِ اسلام معرکہ آرا رہا۔ اس محاذ پر اس کی معرکہ آرائیوں کی داستان ایک دو واقعات اور کارناموں تک محدود نہیں۔ دشمن نے اس محاذ پر مذہبی پیشواؤں کی ایک منظم فوج کھڑی کر رکھی تھی اور ان کے مقابلے میں لے دے کے ایک طلوعِ اسلام تھا جو انہیں شکست پر شکست دے کر تحریکِ پاکستان کے دشمنوں کے منصوبے خاک

میں ملاتا چلا گیا۔ اور اس نے یہ سب انتہائی بے سرو سامانی کے عالم میں بلامزد و معاوضہ کیا۔

حصول پاکستان کے بعد اس دینی محاذ نے نئی صورت اختیار کر لی۔ اب سوال اس مملکت میں خدا کے دین کو عملاً متشکل کرنے کا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد طلوعِ اسلام اسی مقصود و منتہیٰ کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہے اور اس مدت میں اس نے قرآنی نظامِ حیات کے خد و خال کو نکھار اور ابھار کر پیش کرنے کی سعی و کاوش برابر جاری رکھی ہے۔ یہ سعی و کاوش اب تحریکِ طلوعِ اسلام کے نام سے ایک مستقل شکل اختیار کر چکی ہے اور اس موقع پر اس کے مسلک و مقصد کو پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

طلوعِ اسلام کیا کہتا ہے؟ یہ جاننے سمجھنے اور پرکھنے کے لئے یقیناً ان ہزارہا صفحات پر مشتمل کتب کا مطالعہ ضروری ہے جو اس سلسلے میں محترم پرویز صاحب اور ادارہ طلوعِ اسلام اب تک شائع کر چکا ہے لیکن مختصر طور پر اسے سمجھنے اور اندازہ لگانے کے لئے طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک ہی پیش کر دینا کافی ہے تاکہ سعید روحیں جو حقیقت کی متلاشی ہیں انہیں معلوم ہو جائے کہ ہم کہتے کیا ہیں ——؛ ہمارا مسلک یہ ہے کہ :-

(۱) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کی محکومی اور غلامی میں نہ رہے خواہ یہ غلامی ذہنی اور فکری ہو اور خواہ طبعی اور اقتصادی۔

(۲) قوانینِ خداوندی کی اطاعت ایک نظام کی رُو سے ہو سکتی ہے جسے استخلاف فی الارض (یا نظامِ مملکت) کہتے ہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے استخلاف فی الارض کے بغیر دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔

(۳) قرآن کریم نے (بجز مستثنیات) دین کے اصولی قوانین دیئے ہیں اور اسے اس نظام پر چھوڑا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔

(۴) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے نظامِ قرآنی قائم کیا اور اپنے رفقائے کار (صحابہ کبارؓ) کے مشورہ سے قرآنِ کریم کے اصولی احکام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔

(۵) رسول اللہؐ کے بعد دین کا یہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا جو امورِ ملت کو ملت کے مشورہ سے سرانجام دیتے تھے۔ قرآن کے جن اصولوں کی جزئیات اس سے پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں انہوں نے ان کا تعین کیا۔ جن میں کسی رد و بدل کی ضرورت تھی ان میں ضروری تغیر و تبدل کیا جن میں ایسی ضرورت نہیں تھی انہیں علیٰ حالہ باقی رکھا۔

(۶) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا قرآنی

نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا جس میں ہم اس وقت تک مبتلا ہیں۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے اسی انداز کا نظام قائم کیا جائے جو امت کو قرآن کے مطابق چلائے۔

(۷) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا امت کے مختلف فرقے، مختلف جزئیات پر جس جس انداز سے عمل پیرا ہیں کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل کرے۔ یہ حق صرف قرآنی نظام کو پہنچتا ہے کہ وہ ان اختلافات کو مٹا کر پھر سے امت میں وحدت پیدا کرے۔ اس دوران میں اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ دین کے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور وہم میں جو عقائد اور رسومات ایسی رائج ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں ان کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ جو لوگ قرآن کریم کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں وہ اپنی اصلاح کرتے چلے جائیں۔

(۸) قرآن کریم تمام نوع انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے اس کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا لہٰذا نہ قرآن کے بعد خدا کی طرف سے کوئی کتاب آ سکتی ہے نہ رسول اللہ کے بعد کوئی نبی یا رسول۔

(۹) قرآن کا ہر دعوےٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانہ کے علوم و فنون جس حد تک ترقی کر چکے ہیں وہ انسان کے سامنے ہوں اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ یہ تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر لاینفک ہے!

(۱۰) نبی اکرمؐ کی سیرت مقدسہ شرف انسانیت کی معراج کبریٰ کی مظہر تھی لیکن بد قسمتی سے ہماری کتب روایات و تاریخ میں ایسی باتیں شامل ہو گئی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ آپ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن کریم کے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے۔ تو وہ بات ہمارے نزدیک وضعی ہے اور حضورؐ کی طرف غلط منسوب۔ ضرورت ہے کہ سیرت نبویؐ کے صحن چمن سے ان کانٹوں کو الگ کر دیا جائے جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں، اور نہ ہی ان سے حضورؐ کی سیرت مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔

(۱۱) ہم دین میں فرقہ سازی کو شرک سمجھتے ہیں اس لئے ہم کوئی فرقہ پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ احکام اسلامی کے متعلق البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان کی پابندی محض ایک رسم کے طور پر نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ان کی روح پر بھی نگاہ رکھنی چاہیئے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو ونما ہو جائے تاکہ نوع انسانی اس زندگی میں سر اٹھا کر چلنے، اور اس کے بعد کی زندگی میں شرفِ انسانیت کے باقی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکے!

(۱۳) قرآنی نظام میں تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوتی ہے اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ وسائل پیداوار معاشرہ کی تحویل میں رہیں نہ کہ افراد کی ذاتی ملکیت میں جس میں معاشرہ کوئی دخل نہ دے سکے۔ یاد رہے کہ یہ تصور کمیونزم کے تصور سے یکسر مختلف ہے جس میں انسان کی طبعی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کا تصور ہی نہیں ہوتا — یہ وجہ ہے کہ قرآن کا نظام ربوبیت نہ سرمایہ داروں کے لئے خوش آیند ہو سکتا ہے، نہ کمیونسٹوں کے لئے!

یہ ہیں مختصر الفاظ میں دین کے متعلق وہ نظریات و تصورات جنہیں طلوعِ اسلام ایک عرصہ سے قوم کے سامنے پیش کرتا چلا آرہا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ملک میں ایسی فضا عام کی جائے جو قرآنی نظام کی تشکیل کے لئے سازگار ہو، اور جب اس نظام کی ابتداء اس خطۂ زمین میں ہو جائے تو پھر اس کی حدود کو وسیع کرتے جائیں تاکہ اس طرح آہستہ آہستہ ساری زمین اپنے نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ اور جس مقصد کے لئے قرآن دنیا میں آیا تھا وہ مقصد پورا ہو جائے۔

محترم پرویز صاحب کے پیغام کا دوسرا حصہ اس کے طریق کار سے متعلق ہے۔ بلاحظہ فرمایئے:۔

تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ (دیگر ممالکِ اسلامیہ کو چھوڑیئے خود) ہندوستان میں گزشتہ ایک صدی میں مسلمانوں کی متعدد تحریکیں اٹھیں۔ ہر تحریک کا آغاز اس جوش و خروش اور ولولہ وطنطنہ سے ہوتا جیسے کوئی سیلاب امنڈے چلا آرہا ہو۔ ایسا دکھائی دیتا کہ یہ تحریک، مخالف کے ہر سنگ گراں کو خس وخاشاک کی طرح بہا لے جائے گی اور اس برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی اپنی منزل تک پہنچ کر دم لے گی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نظر آتا — کہ وہ تحریک یوں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی كَاَنْ لَّمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا — ان تحریکوں کے مقاصد کی بلندی یا ان میں شریک ہونے والوں کے حسنِ نیت میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے باوجو

ان کے اس طرح ناکام رہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ ان تحریکوں کی بنیادیں خالص جذبات پر رکھی گئی تھیں جن میں فکر و تدبر کا دخل نہیں تھا۔ خالی جذبات پر ابھری ہوئی تحریکیں درد کی طرح اٹھتیں اور آنسوؤں کی طرح بیٹھ جایا کرتی ہیں۔ قرآن کریم نے اپنی تحریک کی بنیاد فکر و شعور پر رکھی ہے۔ وہ انسان کی فکری صلاحیتوں کو ابھارتا ہے۔ انہیں سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ان کی عقل و فکر (Reason) کو اپیل کرتا ہے اور دلیل و برہان کی رو سے ان کی نگاہ میں آہستہ آہستہ تبدیلی پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ جب وہ اس طرح اس تحریک سے علیٰ وجہ البصیرت ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو پھر انہیں آگے قدم بڑھانے کی دعوت دیتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ انسان جو قدم پورے غور و فکر کے بعد علیٰ وجہ البصیرت آگے بڑھائے وہ اسے پھر پیچھے نہیں ہٹایا کرتا۔

چونکہ ہماری تحریک کی بنیادیں قرآنی حقائق پر استوار ہیں اور اس کا مقصد قرآنی نظام کی تشکیل ہے اس لئے اس تحریک کے عام کرنے کے لئے ہم نے طریق بھی وہی اختیار کیا ہے جسے قرآن کریم تجویز کرتا ہے۔ یعنی فکری طریقِ عمل — ہم بھی ہر ایک سے بہ اتباعِ رسالت یہی کہتے ہیں کہ اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ — میں آپ سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ — اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ۔ تم خدا کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ — ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا۔ (۳۴/۴۶) اس کے بعد سوچو! اگر تم نے سوچنا شروع کر دیا کہ انسانیت کی منزل کون سی ہے اور ہم کس راستے پر چلے جا رہے ہیں تو تم یقیناً قرآن کی دعوت سے متفق ہو جاؤ گے۔

جو احباب اس طرح ذہنی طور پر اس فکر سے ہم آہنگ ہو جائیں ان کے سامنے اگلا مرحلہ یہ آتا ہے کہ جن حقائق کو انہوں نے ذہنی طور پر صحیح سمجھا ہے ان کے مطابق اپنے قلب میں بھی تبدیلی پیدا کریں اس لئے کہ قرآن اپنی تحریک کی کامیابی کے لئے صرف ذہنی انقلاب ہی کو کافی نہیں سمجھتا وہ اس کے ساتھ قلبی تبدیلی کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا نام سیرت کی پختگی یا انسانی ذات کا استحکام ہے۔ وہ اس طرح تطہیر فکر و نگاہ سے ایسے افراد تیار کرتا ہے جو قرآنی نظام کی بنیادوں کو استوار کریں۔ وہ ان کے داخلی انقلاب سے خارجی انقلاب عمل میں لاتا ہے بلکہ یوں کہیے کہ یہ خارجی انقلاب درحقیقت ان کے داخلی انقلاب کا فطری مظہر ہوتا ہے۔

لیکن برادران! انقلاب کا یہ طریقہ بڑا صبر آزما اور ہمت طلب ہوتا ہے۔ اس میں فرہادی استقامت اور کوہکنی استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں قدم قدم پر پروانے کی طرح خاموشی سے جل جانے اور اُف تک نہ کرنے کی منزلیں آتی ہیں۔ اس میں نہ نمائش کے مواقع ہوتے ہیں، نہ نمود کی گنجائش

نہ ذاتی صلہ کی امید، نہ ستائش کی توقع۔ یہ راستہ لمبا بھی ہوتا ہے اور پُر خار بھی، غیر مانوس بھی ہوتا ہے، اور آبلہ انگیز بھی۔ اس میں لاکھ جی گھبرائے اور ہزار طبیعت اکتائے (SHORT CUT) کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس طریقِ انقلاب کے جاں گسل مراحل کی صبر آزمائی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انقلابِ قرآنی کے اوّلین داعی، حضورؐ نبی اکرمؐ کی عمرِ نبوت تیئس ۲۳ سال تھی۔ اس تیئس ۲۳ سال میں تیرہ سال کا عرصہ (یعنے قریب چھپن فی صدر) اسی داخلی انقلاب میں صرف ہو گیا۔ غور کیجئے کہ کتنی بڑی ہے یہ قیمت جسے قرآن مانگتا ہے۔ لیکن اس کے ادا کئے بغیر چارہ ہی نہیں۔ اس راہ میں صبر طلبیٔ عشق، بیتابیٔ تمنا کی کوئی پروا نہیں کرتی۔ اس لئے کہ فطرت اپنے قوانین میں (جن کی رُو سے اس نے تخم کاری اور ثمر ریزی کے درمیان ایک متعین وقفہ رکھا ہے) کسی کے لئے تبدیلی نہیں کرتی۔ چنانچہ قرآن شاہد ہے کہ خود نبی اکرمؐ کے دل میں بھی اس کا خیال پیدا ہوتا تھا کہ نہ معلوم ہماری یہ تگ و تاز میری زندگی میں ثمر بار ہو سکے گی یا نہیں۔ اس کے جواب میں آپ سے کہہ دیا گیا کہ — اِنْ مَا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ — ان مخالفین کی تباہی و بربادی کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے (کہ ایسا ہو کر رہے گا) ہو سکتا ہے کہ وہ تیری زندگی میں سامنے آجائے اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تیری وفات کے بعد ظہور میں آئے۔ لیکن تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ کب ظہور میں آتا ہے فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَیْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) — تمہارے ذمہ یہی ہے کہ تم اس پیغام کو عام کرتے جاؤ۔ یہ دیکھنا ہمارے ذمہ ہے کہ سعی و عمل کے نتائج نمودار کب ہوتے ہیں؟ کسان کا کام ہل جوتنا، تخم ریزی کرنا، کھیت کو پانی دینا، اس کی رکھوالی کرنا ہے۔ اس کی کھیتی پکے گی کب؟ یہ چیز ہمارے قانونِ مکافات سے متعلق ہے جس پر کسان کی عجلت اور بے تابی کوئی اثر نہیں کر سکتی۔ یہ ہے برادران! انقلاب آفرینی کا وہ بظاہر خاموش لیکن بہ باطن تلاطم انگیز طریقہ جسے قرآن اپنی تحریک کی کامیابی کے لئے تجویز کرتا ہے۔

جو احباب قرآنی فکر کے اس راستے میں ہمارے رفیقِ سفر بننے پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں ہم کوشش کرتے ہیں کہ یہ حقیقت ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جائے کہ یہ راستہ بڑا صبر آزما اور استقامت طلب ہے جس میں خالی جذبات کی ولولہ انگیزی کچھ کام نہیں آتی۔ نہ صرف یہ کہ کچھ کام نہیں آتی — بلکہ تخریبی نتائج پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے اس کی وضاحت اس لئے ضروری سمجھی ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ احباب ہمارے ہمسفر ہونے کے لئے آگے بڑھتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر اس حوصلہ شکن مسلک پر زیادہ دیر تک گامزن نہیں رہ سکتے۔ ان کی بے تابیٔ تمنا، انہیں رہ رہ کر "ہنگامہ خیزی" پر اکساتی

(باقی صفحہ ۷۷ پر ملاحظہ ہو)

۱۹۷ء

ق۔

خدا کی مرضی

(تقدیر کا مسئلہ)

پرویز صاحب کی تقریر جس سے انہوں نے

طلوعِ اسلام کنونشن

منعقدہ مارچ ۱۹۶۶ء سے خطاب کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خدا کی مرضی

مائی بھولی

برکت ابھی چھوٹا سا ہی تھا کہ اس کا باپ مرگیا۔ اس کی ماں (بھولی) بڑی بے آسرا اور بے سہارا تھی۔ نہ کوئی عزیز نہ رشتہ دار۔ نہ کچھ ہاتھ پلے۔ نہ جائیداد۔ لیکن اس نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اس نے مسلسل محنت مزدوری کی۔ بچے کی اچھی طرح پرورش کی۔ وہ بڑھا۔ پھولا۔ جوان ہوا۔ کام کاج پر جانے لگا۔ مائی بھولی کے دن پھر گئے۔ اسے سکھ کا سانس آیا۔ وہ بیٹے کو دیکھ کر خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی۔ اب وہ اس کی شادی کی فکر میں تھی کہ ایک رات اچانک برکت کی پسلی میں درد اٹھا۔ رات بمشکل گزاری۔ صبح گاؤں کے سیانے سے دوا لی۔ کچھ فائدہ نہ ہوا۔ وہ بچاری پاگلوں کی طرح ماری ماری پھر رہی تھی۔ اس نے میاں جی سے دم بھی کرایا۔ سائیں جی سے تعویذ بھی لیا۔ درگاہ شریف پر منت بھی مانی۔ لیکن برکت کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ آخر تین دن کے بعد اس نے تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ مائی بھولی کی دنیا لٹ گئی۔ وہ تباہ ہوگئی۔ اس کا کوئی نہ رہا۔ خاوند مرا تھا تو اتنی ہمت تھی کہ محنت مزدوری کرکے بچے کو پال لیا۔ اب بڑھاپے میں اس کی ہمت بھی نہ تھی۔ وہ دن رات روتی۔ گاؤں کی عورتیں اسے حوصلہ دلانے کے لئے آتیں اور کہتیں کہ اب صبر کرو۔ صبر کے بغیر چارہ ہی کیا ہے۔ جب اللہ کی مرضی ہی ایسی تھی تو تم کیا کر سکتی تھیں۔ اس مالک کے سامنے کسی کی دم مارنے کی حیا نہیں۔ وہ جو چاہے سو کرے۔ وہ بڑا بے نیاز ہے ـــــ مائی بھولی یہ سن کر خاموش ہو جاتی ـــــ خاموش ہو جانے کے سوا چارہ بھی کیا تھا؟ ـــــ لیکن جب وہ رات کی تنہائیوں میں چپکے چپکے روتی اور سوچتی کہ بالآخر خدا کی مرضی یہی کیوں تھی کہ وہ ایک غریب، بوڑھی بیوہ کی زندگی کا ایک ہی سہارا چھین کر لے جائے۔ تو یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی۔

عبدالرزاق بڑا محنتی تھا۔ لیکن نہ معلوم کیا بات تھی کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا اس میں ناکامی ہوتی۔

عبدالرزاق

جو سودا کرتا اس میں خسارہ ہوتا۔ تھوڑی سی پونجی تھی وہ انہی خساروں کی نذر ہو گئی۔ پانچ چھ بچے۔ بیوی۔ بیوہ بہن۔ اتنا بڑا کنبہ۔ آمدنی کی کوئی صورت نہ۔ کال سماں۔ وہ سخت تنگ آ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اور وہ کیا کرے۔ وہ جس سے بات کرتا وہ کہتا کہ بھائی میاں! رزق اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جس کی روزی چاہتا ہے کشادہ کر دیتا ہے جس کی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ انسان اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ

بہ ناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیران بماند

اس لئے انسان کو حیلہ تو ضرور کرنا چاہیئے لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسے ملے گا اتنا ہی جتنا خدا چاہے گا۔ یہ پوچھنا انسان کا حق نہیں کہ اسے تنگی کیوں دی جاتی ہے اور دوسروں کو رزق اتنا فراواں کیوں ملتا ہے۔ یہ بات خدا کی مرضی پر موقوف ہے اور خدا سے جھگڑنا یا شکایت کرنا انسان کو کافر بنا دیتا ہے۔ اس لئے مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ راضی برضا رہے۔

شہامد دس نمبریہ بدمعاش تھا۔ اول درجہ کا غنڈہ۔ جس سے ہاتھ ملاتا اسے بعد میں دیکھنا پڑتا کہ اس کی پانچوں انگلیاں موجود ہیں۔ ایک آدھ اڈا تو نہیں تھا نہ کوئی کام۔ نہ کاج۔ دھوکے فریب پر گزارہ۔ ہرا سال۔ بانکے دھاڑے۔ جنگ کے بعد ملٹری کے ٹرک نیلام ہوئے۔ اس نے جوئے سے کچھ رقم ماری۔ ایک ٹرک

محلے کا چودھری

خرید لیا۔ اس سے جو کام بڑھنا شروع ہوا تو ایک ٹرک کی جگہ دو۔ دو کی جگہ چار۔ اس کے بعد اس نے دو تین بسیں بنوالیں۔ دھڑا دھڑ آمدنی ہونے لگی۔ گلی میں شاندار مکان بنایا۔ افسروں حاکموں سے رابطہ بڑھا۔ سرکار دربار میں کرسی ملنے لگی۔ اب شہامد محلے کا رئیس تھا۔ اس لئے چودھری الیکشن میں کھڑا ہوا تو کس کی مجال تھی کہ مقابلہ میں سامنے آتا۔ بلا مقابلہ ممبر منتخب ہو گیا۔ اس کا جلوس نکلا تو بڑے بوڑھے سب سر ہلا کر کہتے تھے کہ ہاں بھائی! عزت اور ذلت سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے شاہنشاہ بنا دے۔ جسے چاہے خاک سیاہ کر دے۔ اس میں انسان کی کاریگری کو کوئی دخل نہیں۔ یہ سب خدا کی شان ہے۔ یہ تمام فیصلے اس کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں۔ کل تک جن کی ڈیوڑھی میں نوبت بجتی تھی وہ آج پیسے پیسے کے محتاج ہو رہے ہیں اور جنہیں کوئی اپنے پاس تک نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ وہ تخت نشین ہو گئے ہیں۔ وہ بڑا بے پرواہ ہے۔

لڑکیوں کی ماں

نور خان کی بیوی کے اوپر تلے چار لڑکیاں پیدا ہوگئیں۔ ہر لڑکی کی آمد پر گھر میں صف ماتم بچھ جاتی۔ چوتھی لڑکی کی پیدائش کے بعد ماں باپ۔ عزیز و اقارب، سب کے اصرار سے نور خان دوسری شادی کرنے کی ٹھان چکا تھا۔ بیوی نے ہزار منتوں سماجتوں سے اسے روکا۔ وہ اس وقت تو رک گیا لیکن بیوی سے صاف صاف کہدیا کہ اگر پھر لڑکی پیدا ہوئی تو وہ ضرور دوسری شادی کرے گا۔ اور بیچاری کی بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ پانچویں بار پھر لڑکی پیدا ہوگئی۔ نور خان کی بیوی کو غش پر غش آتے تھے۔ دل کے دورے پڑتے تھے۔ لیکن اس سے ہر ایک ناراض تھا۔ خاوند اُدھر کا رُخ تک نہیں کرتا تھا۔ وہ تنہا چارپائی پر پڑی روتی رہتی۔ گلی محلے کی عورتیں آتیں اور اسے تسلی دیتیں کہ یہ سب خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ جسے چاہے لڑکے دے۔ جسے چاہے لڑکیاں دے۔ تمہارے رونے دھونے سے کیا حاصل ہے۔ جب خدا کا لکھا ہی ایسا تھا تو اسے کون مٹا سکتا ہے۔ مرضی مولا بر ہمہ اولیٰ۔ صبر شکر کر کے مصیبت برداشت کرو۔ خدا جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ وہ مالک ہے۔ جس حال میں چاہے رکھے۔ (حضرت) سلیمانؑ نے جی میں کچھ شکوہ شکایت کیا تھا تو بارہ برس تک بھلیاری کا بھٹ جھونکنا پڑا تھا۔ اس لئے کوئی ایسی ویسی بات زبان پر نہ لانا۔ وہ بڑا بے پرواہ ہے۔

نادرہ بیچاری

نادرہ کی شادی اس کے خالہ زاد بھائی سے ہوئی تھی۔ یہ لڑکا شروع ہی سے آوارہ تھا۔ عزیز رشتہ داروں نے نادرہ کی ماں سے بہتیرا کہا کہ لڑکا ٹھیک نہیں، لیکن وہ یہی کہتی رہی کہ میں نے پہلے دن سے یہ لڑکی اپنی بہن کو دے رکھی ہے۔ اب میں زبان نہیں بدل سکتی۔ نتیجہ یہ کہ چند ہی دنوں کے بعد، گھر میں لڑائی جھگڑا شروع ہوگیا۔ ساس نے بھی بیٹے کا ساتھ دیا۔ قصہ کوتاہ، نادرہ تپ دق لیکر بیٹھ آ بیٹھی۔ جب اڑوس پڑوس کی عورتیں، نادرہ کی ماں سے افسوس کرتیں تو وہ کہہ دیتی کہ بہن! اس میں کسی انسان کا کوئی بس نہیں ہوتا۔ روحوں کا تو عرش پر ملاپ ہو چکا ہوتا ہے کوئی لاکھ کچھ کرے، رشتے وہیں ہوتا ہے جہاں کا سنجوگ ہو۔ تقدیر کے آگے کسی کی پیش چل نہیں سکتی۔ ماتھے کا لکھا سامنے آکر رہتا ہے۔ آدمی لاکھ جتن کرے، ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔ جب اللہ کی مرضی ہی ایسی تھی تو ہم کیا کر سکتے تھے! بڑے بڑوں کی لڑکیاں گھروں میں بیٹھی ہیں۔ ہم کس قطار شمار میں ہیں۔ تقدیر کے سامنے تدبیر کچھ نہیں کر سکتی۔

برادران عزیز! یہ نہ تو کسی برکت اور مائی بھولی کی داستانیں ہیں، نہ عبدالرزاق اور شہامد کے قصے۔

روزمرّہ کے واقعات

نہ کسی نورخان اور اس کی بیوی کی کہانی ہے، نہ نادرہ اور اس کی ماں کا افسانہ۔ یہ وہ واقعات ہیں جو ہمارے معاشرہ کا جزو ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں ہم ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں۔ جہلا ہی میں نہیں، اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگوں میں۔ بیوقوفوں میں ہی نہیں، بڑے بڑے سمجھداروں میں۔ جس جگہ دیکھئے، تقدیر کا رونا رویا جاتا ہے۔ جہاں سنئے انسان قسمت کے ہاتھوں بے بس بتایا جاتا ہے۔ جس محفل میں بیٹھئے، سرد آہوں کے ساتھ یہ آواز کان میں آتی ہے کہ — وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے — جس معاملہ پر گفتگو ہو، ٹیپ کا بند یہی ہوتا ہے کہ

سب کام اپنے کرنے تقدیر کے حوالے
نزدیک عارفوں کے تدبیر ہے تو یہ ہے

"عارفوں" کے نزدیک راضی برضا رہنا، خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہے۔ وہ "حرفِ شکایت" زبان پر لانا بارگاہِ صمدیت میں انتہائی گستاخی سمجھتے ہیں۔ "حرفِ شکایت" تو ایک طرف، ان کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لئے دعا نہ کریں

ارباب شریعت کی طرف آیئے تو وہ انسان کی ہر بے بسی کی تائید میں قرآن کی کوئی نہ کوئی آیت پڑھ دیں گے۔ مریض کا ذکر ہے تو وعظ کا انداز یہ ہوگا کہ صحت اور بیماری۔ موت اور زندگی سب خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے

شریعت کا فتویٰ

— موت کا ایک دن مقرر ہے — اس میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ (هُوَ) يُحْيِي وَ يُمِيتُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲/۲۵۸) "وہی مارتا ہے وہی جلاتا ہے۔ اور وہ ہر شے پر قادر ہے"۔ رزق کے متعلق گفتگو ہوگی تو وہ فرما دیں گے کہ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ (۳۹/۵۲)۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ خدا جس کے لئے چاہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کی روزی چاہے تنگ کر دیتا ہے۔ عزت اور ذلت کا سوال آئے گا تو یہ آیت فر فر پڑھ دی جائے گی کہ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (۳/۲۶) "تو جسے چاہے عزت دے۔ جسے چاہے ذلیل کر دے"۔ اولاد کا سوال سامنے آئے گا تو کہہ دیا جائے گا کہ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ (۴۲/۴۹) وہ جسے چاہے لڑکیاں دے۔ اور جسے چاہے لڑکے عطا کر دے۔ وہ تقدیر کا فلسفہ بیان کرتے کرتے اور آگے بڑھیں گے اور ارشاد فرمائیں گے کہ سن رکھو! يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ (۱۶/۹۳)۔ وہ جسے چاہے گمراہ کر دے۔ اور جسے چاہے ہدایت دیدے۔ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۱۳/۳۳)۔ جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

اور جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے تو پھر اگلی بات تو اس کا منطقی نتیجہ ہوتی ہے کہ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲/۲۸۴)۔ وہ جسے چاہے بخشدے۔ جسے چاہے عذاب دے۔ اللہ ہر شے پر قادر ہے — اور پھر اس کی تائید میں اس قسم کی سندیں کہ

اوتھے کیہہ پرواہ ہے راقب اوتھے بے پرواہیاں
پھڑ لئے عملاں والیاں نوں۔ چھڈ دیئے اوگن ہاریاں

بلکہ یہ کہ گنہگار، خدا کو زیادہ پیارے ہوتے ہیں

کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

ہر لیگاڑ کے وقت

پھر تماشا یہ ہے کہ "خدا کی مرضی" وہاں آتی ہے جہاں کوئی کام بگڑ جائے۔ مریض کو شفا ہو جائے تو کہا جائے گا کہ فلاں ڈاکٹر کے علاج سے فائدہ ہوا۔ اور اگر وہ مر جائے تو بے ساختہ کہا جائے گا کہ خدا کی مرضی ایسی ہی تھی۔ لڑکا امتحان میں کامیاب ہو جائے تو یہ اس کی اپنی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے، اور اگر فیل ہو جائے تو یہ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ لڑکا پیدا ہونے پر گھر والے اکڑ کر چلیں گے اور لڑکی پیدا ہونے پر کہا جائے گا کہ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی۔ کاروبار میں ترقی ہو تو انسان کی اپنی ہنرمندی ہے۔ اور اگر وہ ناکام رہ جائے تو یہ خدا کی مرضی تھی۔ غرضیکہ "خدا کی مرضی" شکست اور ناکامی کے وقت سامنے آئے گی۔ حتیٰ کہ اس سلسلہ میں عربی زبان کا ایک فقرہ مقدس سند کے طور پر پیش کر دیا جائے گا۔ رجسے عام طور پر حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، کہ عَرَفْتُ رَبِّيْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ میں نے اپنے رب کو اپنی اسکیموں کے ناکام رہ جانے سے پہچانا ہے۔

آپ غور کیجئے کہ جس قوم کے اس قسم کے معتقدات اور نظریات ہوں — اور یہ نظریات صدیوں سے متوارث چلے آرہے ہوں، کشمکش حیات میں اس قوم کی شکست خوردگی کی حالت کیا ہوگی، اور زندہ قوموں کی صف میں اس کا مقام کیا؟ ہم اپنے زوال کے اسباب و علل معلوم کرنے کے لئے تحقیقاتی کمیشن بٹھاتے ہیں، لیکن کیا

اسباب زوال

ان معتقدات کی موجودگی میں ہمارے زوال کے اسباب معلوم کرنے کے لئے کسی تحقیق کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ باقی دنیا میں کسی فرد یا قوم کو اپنی اسکیم میں ناکامی ہو جائے وہ کھڑی ہو کر سوچے گی کہ میں نے کہاں غلطی کی جو نتیجہ میرے حسب منشاء نہیں نکلا۔ اس اسکیم کی کامیابی کے وسائل و ذرائع میں کونسی کمی رہ گئی جو میری کوششیں بے نتیجہ رہ گئیں۔ اس مہم کے سر کرنے میں اسباب و علل کی زنجیر کی کونسی کڑی کمزور رہ گئی جو کمند لب بام آکر ٹوٹ گئی۔ وہ قوم کھڑی ہو کر سوچے گی۔ ناکامی کے اسباب

وجوہات کی تحقیق کرے گی۔ اور اس کا سراغ لگانے کے بعد اس کمی کو پورا کر کے، ایک بار پھر کوشش کرے گی۔ اور ایسا کرتی رہے گی تا آنکہ وہ اپنی اسکیم میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن جس قوم کا عقیدہ یہ ہو کہ شکست اور ناکامی خدا کی مرضی سے ہوتی ہے۔ اس میں انسان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ ہر بات، انسان کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کے مقدر میں لکھ دی جاتی ہے۔ اور تقدیر کے لکھے کو مٹانا یا بدل دینا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہوتا۔ سوچئے کہ مصافِ زندگی میں اس قوم کا کوئی مقام بھی ہو سکتا ہے؟ وہ کشمکشِ حیات میں کسی خطرہ کا بھی مقابلہ کر سکتی ہے؟ وہ محاسبۂ خویش سے، اپنے نقائص کی درستگی، اور اپنی غلطیوں کی اصلاح سے، ایک قدم بھی آگے بڑھا سکتی ہے؟ نہیں۔ وہ فطرت کے "بقائے اصلح" کے اٹل قانون کے مطابق، دنیا میں زندہ بھی رہ سکتی ہے؟

متضاد ذہنیت

پھر اس میں ایک پہلو اور بھی قابلِ غور ہے۔ مثلاً جب ایک شخص بیمار ہو جاتا ہے تو ہم اس کے علاج معالجہ کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ بہترین ڈاکٹر سے مشورہ کرتے ہیں۔ عمدہ سے عمدہ دوائیاں لاتے ہیں۔ جس علاج سے فائدہ نہیں ہوتا اسے بدل دیتے ہیں۔ ہر قسم کی احتیاط برتتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ مرض اور شفا۔ موت اور زندگی، سب خدا کے اختیار میں ہے۔ اس نے ایک ایک بات کو پہلے سے لکھ دیا ہوا ہے۔ اور اس کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ تقدیرِ خداوندی کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ پہلے ہی سے مقدر ہے کہ اس شخص کو فلاں وقت پر فلاں بیماری آئے گی۔ اتنے دنوں تک بیماری رہے گی۔ اس کے بعد، یہ اچھا ہو جائے گا۔ یا مر جائے گا۔ اگر یہ سب کچھ پہلے سے مقدر ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، تو پھر اس علاج معالجہ کا کیا فائدہ، اور یہ تگ و دو کس لئے؟ کیا یہ خدا کی تقدیر کے خلاف جنگ نہیں؟ کیا یہ اللہ کی مرضی کا مقابلہ نہیں؟ لیکن جس سے یہ بات کیجئے وہ کہہ دے گا کہ یہ تو حقیقت ہے کہ سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور اس نے یہ کچھ پہلے سے لکھ دیا ہے لیکن اس کے باوجود، انسان کے لئے تدبیر کرنا بھی فرض ہے: ذرا سوچئے کہ ہم یہ کیا کہتے ہیں؟ کیا ایسا کہنے سے ہم اپنے عقیدہ کا منہ نہیں چڑاتے؟ کیا ہم اپنی تدبیر کی ہنسی نہیں اڑاتے؟ کیا ہم خدا کے اٹل فیصلوں کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے؟ یا کیا ہم دیدہ دانستہ ایک عبث کوشش، اور بے نتیجہ تگ و تاز میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہیں کرتے۔ لیکن ہم وہ بھی مانتے ہیں اور یہ بھی کرتے ہیں۔ خدا کی مرضی پر ایمان رکھنے کے بعد تو صحیح روش وہی ہے جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو لوگ میرے لئے دعا نہ کریں

لیکن مشکل یہ ہے کہ خود یہ کچھ کہنے والا اپنے دکھ کی دوا بھی کرتا ہے اور لوگوں سے اس کے لئے دعا بھی کراتا ہے ۔۔۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس دورُخی زندگی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ جسے نفسیاتی اصطلاح میں تضادِ ذات یا (DUAL PERSONALITY) کہا جاتا ہے اور جس کا فطری نتیجہ انسانی ذات کی تباہی ہوتا ہے۔ اس سے انسان (اور اقوام) کے حوصلے پست، جرأتیں مردہ، عزائم مفلوج، آرزوئیں مصلوب، ولولے پژمردہ اور مقاصد افسردہ ہو جاتے ہیں۔ نہ اُسے کسی بات پر یقین محکم ہوتا ہے۔ نہ حصولِ مقصد کے لئے عمل پیہم۔ ان کی ساری زندگی لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۔ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ (۴/۱۴۳) ۔ کے جہنم میں گذرتی ہے۔ اور وہ یہ کہہ کر دنیا سے چلے جاتے ہیں کہ

آئندہ و گذشتہ، تمنا و حسرت است
یک "کاشکے" بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

یعنی

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا!

سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم کی یہی تعلیم ہے؟ کیا اس کی ان آیتوں کا، جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے وہی مفہوم ہے جس مفہوم کے لئے انہیں پیش کیا جاتا ہے؟ کیا وہ ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک مجبورِ محض مشین کی طرح بھیج دیا گیا ہے کہ اس کی ہر حرکت بٹن دبانے والے کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے؟ کیا وہ تانگے کا گھوڑا ہے جو اپنی مرضی سے نہ کہیں آسکتا ہے نہ جا سکتا۔ جس راستے پر اس کا مالک چلاتے، اسے چلنا پڑتا ہے؟ کیا وہ ایسا ہی زندانیِ تقدیر ہے کہ اس کی کوئی تدبیر اسے اس جیل خانے سے نکال نہیں سکتی؟ کیا وہ قسمت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے، کہیں آنا جانا تو ایک طرف، ہل تک بھی نہیں سکتا؟ کیا انسان کی اس دنیا میں یہی پوزیشن ہے؟ آیئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

قرآن کی تعلیم

آپ قرآن کریم اٹھایئے۔ اور الحمد سے والناس تک دیکھ جایئے۔ اس کی تعلیم ایک ہی محور کے گرد گردش کرتی دکھائی دے گی۔ وہ محور وہ مرکزی نقطہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل۔ یعنی یہ اصولِ اساسی کہ ہر انسان، اپنے کئے کا آپ ذمہ دار ہے اور اسے اپنے ہر عمل کا نتیجہ مل کر رہتا ہے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)۔ انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے

وہ کوشش کرے اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۙ (۵۳/۳۸)۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۖ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ (۱۷/۷)۔ اگر تم اچھے کام کرو گے تو ان کا فائدہ تمہاری اپنی ذات کو ہوگا۔ اگر برے کام کرو گے تو اس کا وبال بھی تمہارے اپنے اوپر پڑے گا۔ قَدْ جَاۗءَكُمْ بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۭ (۶/۱۰۴)۔ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے واضح حقائق آ گئے۔ جو آنکھیں کھول کر انہیں دیکھے گا اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ جو آنکھیں بند کر لے گا وہ اس روشنی سے محروم رہ جائے گا۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (۹۹/۷-۸)۔ جس نے ایک ذرہ برابر بھی اچھا کام کیا ہوگا وہ بھی اس کے سامنے آ جائے گا اور جس نے ایک ذرہ برابر برا کام کیا ہوگا وہ اسے بھی دیکھ لے گا۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ (۱۰۱/۶-۹)۔ پھر جس کا اچھے کاموں کا پلڑہ بھاری ہوگا اس کی زندگی بڑی خوشگوار گذرے گی۔ جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا وہ جہنم میں ہوگا۔ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝ (۵۲/۲۱) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں رہن رکھا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (۴۵/۲۲)۔ خدا نے اس کارگہ کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ مل جائے اور اس پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ یعنی یہ سلسلۂ کائنات۔ یہ ارض و سما اس لئے رات دن مصروفِ گردش ہے کہ انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔

اختصار کی غرض سے، میں ان چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ قرآن کریم سے اس باب میں سینکڑوں آیات پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان آیات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ، انسان کو اس کے ہر کام کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور اس کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ذمہ دار اسے ہی ٹھہرایا جا سکتا ہے جو صاحبِ اختیار و ارادہ ہو۔ جو مجبور ہو، وہ ذمہ دار قرار ہی نہیں پا سکتا۔ جرمِ قتل کا ذمہ دار تلوار کو نہیں ٹھہرایا جاتا جو مقتول کے حلق پر چلی تھی۔ ذمہ دار اس شخص کو ٹھہرایا جاتا ہے جس نے وہ تلوار چلائی تھی۔ اور اسے بھی اسی صورت میں ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے کہ اس نے بقائمی ہوش و حواس قتل کیا ہو۔ پاگل کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو دیگر مخلوق پر جو شرف حاصل ہے وہ اس کے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کی بنا پر ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں، خطِ امتیاز ہی یہ ہے۔ کائنات کی کوئی شے اپنے اختیار و ارادہ سے کچھ

صاحبِ اختیار و ارادہ

نہیں کرتی۔ جو فریضہ جس چیز کے سپرد کیا گیا ہے وہ اسے بلا اختیار و ارادہ مشین کی طرح ادا کئے جا رہی ہے — وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰) انہیں جو حکم دیا جاتا ہے وہ اس کے مطابق کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس، آدم (یعنی انسان) کا تعارف ہی یہ کہہ کر کرایا گیا ہے کہ خدا نے اسے ایک حکم دیا۔ وَ عَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّہٗ (۲۰/۱۲۱)۔ اور اس نے اس حکم کی خلاف ورزی کی۔ آپ دیکھئے! آدم کے تمثیلی قصہ میں، تین کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک ملائکہ — یعنی قوائے فطرت — جن کے متعلق کہا گیا کہ وہ احکام خداوندی کی اطاعت، بلا اختیار و ارادہ کرتے ہیں۔ دوسرے انتہا پر ابلیس، جو اطاعت کرتا ہی نہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان آدم، جو معصیت کی قدرت رکھنے کے باوجود، احکام خداوندی کی اطاعت کرتا ہے۔ اور یہی اس کا شرف ہے۔ نیکی اس کی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھنے کے باوجود نیکی کرے۔ نہ مجبور کی نیکی، نیکی ہے۔ نہ اس کی بدی، بدی۔ مجبور کی طرف نیکی اور بدی کو منسوب ہی نہیں کیا جا سکتا۔

آیئے! ہم دیکھیں کہ انسان کے اختیار و ارادہ کی وسعتیں کہاں تک ہیں اور اس کی ذمہ داریوں کی حدود کیا ہیں۔

خدا نے کائنات کو پیدا کیا تو اس عظیم کارگہ کے حسن و خوبی چلنے کے لئے قوانین مقرر کر دیئے۔ پانی کو اگر اس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو نشیب کی طرف بہتا ہے۔ ایک خاص حرارت پر پہنچ کر، بھاپ بن کر اڑنے لگتا ہے دوسری طرف، ایک خاص درجہ حرارت پر منجمد ہو جاتا ہے۔ آگ حرارت پہنچاتی ہے۔ سنکھیا ہلاک ہے۔ شہد تقویت بخش ہے۔ یہ قوانین خدا نے اپنی منشاء اور مرضی کے مطابق بنائے ہیں۔ اس میں کسی اور کے ارادہ اور

خدا کی مشیت

منشاء کو کوئی دخل نہیں۔ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (۳/۴۰)۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (۸۵/۱۶)۔ وہ سب کچھ اپنے ارادے کے مطابق کرتا ہے۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ (۲۱/۲۳)۔ کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا کہ اس نے ایسے قوانین کیوں بنائے ہیں۔ اسی لئے ان قوانین کو، قوانین مشیت کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ قوانین جنہیں خدا نے اپنی مرضی سے جس طرح چاہا بنایا ہے۔

ان قوانین کے مطابق اس نے ہر شے میں ایک خاص تاثیر رکھی ہے۔ اسے اس شے کی تقدیر کہتے ہیں۔ قدر کے معنی پیمانے کے ہیں۔ سنکھیا کی تقدیر یہ ہے کہ اس کے پانچ قطرے تقویت بخش ہیں اور پچاس قطرے ہلاکت آفریں۔ آم کی گٹھلی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ مناسب نشوونما سے آم کا پیڑ بن جاتی ہے اور اس میں اسی قسم کے آم لگتے ہیں۔ اشیائے کائنات کی یہ تقدیر اٹل ہوتی ہے۔ اسی کو دورِ حاضر کی اصطلاح میں قوانین فطرت کہتے ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ اسی کو قرآن کریم نے "سنت اللہ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے — یعنی خدا کی روش یا

طریق کار۔ اور یہ واضح کر دیا کہ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲)۔ اس سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں آتی۔ خدا کے قوانین غیر متبدل ہیں۔

صحیح مفہوم

قرآن کریم کی جن آیات کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ "خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے" ان کا درحقیقت مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کائنات میں سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور یہ قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ اور اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ "خدا ہر شے پر قادر ہے"۔ تو اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ خدا نے ہر شے کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں اور جو کچھ ہوتا ہے ان پیمانوں کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ آل عمران میں (جنگ میں شکست کے سلسلہ میں کہا کہ) اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ جب تمہیں نقصان اٹھانا پڑا — حالانکہ اس سے پہلے تم اس سے دُگنا نقصان دشمن کو پہنچا چکے تھے — تو تمہارے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ نقصان کس وجہ سے ہوا۔ یہ کہاں سے آگیا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ ان سے کہو کہ یہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا ہے۔ کہیں اور سے نہیں آگیا۔ اور اس کے بعد ہے اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۳/۱۶۵)۔ اب اگر اس ٹکڑے کا وہ مفہوم لیا جائے جو عام طور پر بیان کیا جاتا ہے — یعنی یہ کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے وہ جو جی چاہے کرے۔ تو آیت کے دونوں ٹکڑوں میں نہ صرف یہ کہ کوئی ربط نہیں رہتا بلکہ دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہو جاتے ہیں۔ یعنی پہلے کہا کہ یہ مصیبت خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔ کہیں اور سے نہیں آگئی۔ اور اس کے بعد کہا کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جس طرح جی چاہے کرتا ہے۔ تمہیں یہ پوچھنے کا کیا حق ہے کہ یہ مصیبت کیسے آگئی اور کہاں سے آگئی۔ لہٰذا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ کے یہ معنی نہیں ہو سکتے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ خدا نے ہر چیز کے لئے پیمانے اور اندازے (قوانین) مقرر کر رکھے ہیں۔ ہر واقعہ اس کے قوانین کے مطابق سرزد ہوتا ہے۔ تم نے پہلے، ان قوانین کا اتباع کیا تو دشمن کو شکست دی۔ اس دفعہ ان قوانین کی خلاف ورزی کی تو نقصان اٹھایا۔ اس سوال کے دریافت کرنے کی ضرورت کیسے پیش آگئی کہ یہ نقصان کیسے ہوا؟ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ کہاں سے آگیا؟ یہ ہوا خدا کے قانون کے مطابق اور ذمہ دار اس کے تم خود ہو جنہوں نے اس قانون کی خلاف ورزی کی۔ یہ اور کہاں سے آگیا؟

اسی حقیقت کو سورۂ نساء میں ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہا کہ ان منافقین کی حالت یہ ہے کہ جب انہیں کامیابی ہوتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے۔ اور جب ناکامی ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس کا ذمہ دار رسول ہے۔ یہ اس کی غلط تدبیروں کا نتیجہ ہے۔ اس کے جواب میں کہا کہ ان سے

کہدو کہ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ (۴/۷۸)۔ یاد رکھو! ناکامی اور کامیابی، سب خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہ تمام نتائج اس کے قوانین کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰہِ۔ جب تم اس کے قانون کے مطابق چلتے ہو تو کامیابیاں اور خوشگواریاں نصیب ہوتی ہیں وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (۴/۷۹)۔ اور جو مصیبت آتی ہے وہ تمہاری اپنی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ یعنی جب تم خدا کے قانون کے خلاف، اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق کچھ کرتے ہو تو اس کا نتیجہ ناکامی اور مصیبت ہوتا ہے۔

بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کے معنی بھی یہی ہیں کہ خدا نے ہر بات کے لئے ایک قانون بنا رکھا ہے اور وہ بات اس قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ دھاندلی اور لاقانونیت کا یہاں کوئی کام نہیں۔

قرآن کریم میں بعض آیات اس قسم کی ملتی ہیں کہ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۶/۹)۔

اگر اللہ چاہتا!

اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے — "اگر اللہ چاہتا تو تم سب صحیح راستے پر چلتے"۔ اور اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ خدا کا یہ منشاء ہی نہیں کہ تمام لوگ صحیح راستے پر چلیں۔ وہ چاہتا ہی یہ ہے کہ لوگ غلط راستے پر بھی چلیں (اور پھر غلط راستے پر چلنے والوں کو جہنم میں بھیج دیتا ہے)! معاذ اللہ۔ اس قسم کی آیات کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اگر خدا کی مشیت یہ ہوتی کہ تمام انسان، بلا اختیار و ارادہ، دیگر اشیائے کائنات کی طرح، ایک ہی راستے پر چلتے جائیں، تو وہ انسان کو اختیار و ارادہ دیتا ہی نہیں۔ اسے مجبور پیدا کر دیتا۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ تھا کہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا جائے۔ تاکہ یہ اپنی مرضی سے خود صحیح راستے پر چلے۔

اس حقیقت کو سورۂ یونس میں اور واضح الفاظ میں بیان کیا گیا۔ پہلے کہا کہ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا۔ اگر خدائی مشیت کا پروگرام ایسا ہوتا تو اس کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کرتا کہ وہ صحیح راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہوتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسان کو اختیار و ارادہ دیا ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے منتخب کر لے۔ اس کے بعد رسول اللہ سے کہا گیا کہ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۹۹) تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ بالضرور ایمان لے آئیں! انسان کو زبردستی مومن (یا کافر) بنانا ہماری مشیت کے پروگرام میں نہیں۔

اسی قبیل سے قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جن میں "اِنْ شَآءَ اللّٰهُ" آتا ہے — ہمارے ہاں

اِنْ شَآءَ اللّٰہ

"اِنْ شَآءَ اللّٰہ" کا استعمال تو آپ کو معلوم ہی ہے - یعنی جس وعدے کے پورا کرنے کی پہلے ہی سے نیت نہ ہو، اس کے ساتھ "اِنْ شَآءَ اللّٰہ" کہہ کر اپنی منافقت کے لئے خدا کی مشیت کو سپر بنا لیا جاتا ہے ۔ آپ اپنے دوست سے کہتے ہیں کہ بھائی! کل چار بجے ٹھیک پہنچ جاؤ گے نا! اور وہ جواب میں کہتا ہے کہ "اِنْ شَآءَ اللّٰہ" - تو آپ کہتے ہیں کہ میاں! ٹھیک ٹھیک بات کہو - ان شآء اللہ کو چھوڑو - اس سے تو تمہاری نیت کا ابھی سے پتہ چل رہا ہے کہ تم آؤ گے نہیں - یہ ہے ہمارے ہاں "انشاء اللہ" کا استعمال -

قرآن کریم میں ان الفاظ کا استعمال دو طرح پر آیا ہے - ایک یہ کہ اگر یہ بات خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوئی تو ضرور ہو کر رہے گی - مثلاً سورۂ ہود میں ہے کہ جب حضرت نوحؑ سے ان کے مخالفین نے کہا کہ جس تباہی کے متعلق تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو اسے لے کیوں نہیں آتے - تو آپ نے جواب میں کہا اِنَّمَا یَاْتِیْکُمْ بِہِ اللّٰہُ اِنْ شَآءَ وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ۝ (۱۱/۳۳) - اس تباہی کا لانا نہ لانا میرے اختیار کی بات نہیں - وہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق آئے گی - جب اسے اس کے قانون کی رو سے آنا ہوگا تو تم اسے روک نہیں سکو گے - وہ ضرور آکر رہے گی -

اور دوسرا انداز یہ ہے کہ چونکہ یہ بات خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہے، اس لئے ہو نہیں سکتا کہ یہ واقع ہو کر نہ رہے - یہ ضرور واقع ہوگی - مثلاً جب حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین اور بھائیوں کو کنعان سے اپنے پاس بلا لیا - اٰوٰی اِلَیْہِ اَبَوَیْہِ - تو اس نے اپنے ماں باپ کو خاص اپنے پاس ٹھہرایا - وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیْنَ ۝ (۱۲/۹۹) - اور دوسرے اعزہ سے کہا کہ اب تم مصر میں آرام سے رہو گے - اس لئے کہ اب تمہارا مصر میں داخلہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو رہا ہے - اور جب یہ اس کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تم امن سے رہو گے -

آپ نے دیکھا کہ وہی "ان شاء اللہ" جو ہمارے ہاں غیر یقینی اور بے اعتمادی کا غماز ہوتا ہے، قرآن کریم کے مفہوم کے مطابق کس قدر حتم و یقین اور مکمل اعتماد کا آئینہ دار ہوتا ہے - اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر اللہ نے چاہا تو ایسا ہوگا - اور جب ویسا نہ ہوا تو کہہ دیا کہ کیا کیا جائے - خدا نے ایسا چاہا ہی نہیں - اس کی ایسی مرضی ہی نہیں تھی - اس کی مرضی میں ہوتا تو اب ہو کیوں نہ جاتا! اس کے معنی یہ ہیں کہ چونکہ یہ بات خدا کے قانون کے مطابق ہے اس لئے یہ ضرور ہو کر رہے گی -

*

اب انسانی دنیا کی طرف آئیے - انسان کی زندگی کے دو حصے ہیں - ایک طبیعی زندگی - دوسری

انسانی زندگی

اس کی انسانی زندگی۔ اس کی طبیعی زندگی پر انہی توانین فطرت کا اطلاق ہوتا ہے جو دوسرے حیوانات پر لاگو ہوتے ہیں۔ آگ میں کتا گر جائے یا انسان کا بچہ۔ دونوں جل جاتے ہیں۔ سنکھیا گھوڑا کھائے یا آدمی، دونوں مر جاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ حیوانات ان چیزوں کو کھا نہیں سکتے جو ان کے لئے مضر ہوتی ہیں — یعنی جنہیں ان پر فطرت نے حرام قرار دیدیا ہے — اور انسان کو اس کا اختیار ہے کہ یہ جی چاہے تو ان سے پرہیز کرے اور جی چاہے تو انہیں کھالے۔ زہر کھانے سے خودکشی کے واقعات، انسان کے اسی اختیار وارادہ کے مظاہر ہیں۔ حیوانات خودکشی کر ہی نہیں سکتے۔

جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کے متعلق توانین مقرر ہیں، اسی طرح اس کی انسانی زندگی کے لئے بھی توانین ہیں۔ یہ توانین اسے وحی کی رو سے ملتے ہیں۔ اسے اس باب میں بھی اختیار حاصل ہے کہ یہ جی چاہے تو ان توانین کے مطابق زندگی بسر کرے، اور جی چاہے تو ان کے خلاف روش اختیار کرلے۔ یہ اُن کے مطابق چلے گا تو اس کی زندگی خوشگواریوں کی ہوگی۔ ان کی خلاف ورزی کرے گا تو جہنم کی زندگی جئے گا۔ مثلاً یہ قانون کہ عدل واحسان کا نتیجہ جنت بداماں معاشرہ ہوتا ہے اور ظلم واستبداد کا نتیجہ جہنم کی تباہیاں — خدا کا اٹل قانون ہے۔ اب انسان کی اپنی مرضی ہے کہ وہ اپنا معاشرہ عدل واحسان کی بنیادوں پر متشکل کرکے اپنے لئے جنت پیدا کرلے۔ یا ظلم واستبداد اور سلب ونہب کا نظام وضع کرکے، جہنم کی زندگی بسر کرے۔ انسان کے اس اختیار میں خدا قطعاً دخل نہیں دیتا — اس نے دخل دینا ہوتا تو انسان کو صاحب اختیار پیدا ہی کیوں کرتا؟ وہ انسانوں سے برملا کہتا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰)۔ تم اپنی دنیا میں جس طرح جی چاہے کرو۔ قانون سازی کی دنیا (عالم امر) میں ہماری مشیت کارفرما تھی۔ ان توانین کی اطاعت ومعصیت کے سلسلہ میں تمہاری مشیت کارفرما ہوگی۔ ہم اس میں دخل نہیں دیں گے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ تم جس قسم کی روش اختیار کرو گے، اس کے مطابق نتائج تمہارے سامنے آجائیں گے۔

انسانی اختیار

یہ تو تمہارے اختیار میں ہے کہ تم زندگی کے دوراہے پر دائیں طرف مڑتے ہو یا بائیں طرف۔ لیکن تمہارے اختیار میں نہیں کہ تم مڑو تو دائیں طرف، اور پہنچ جاؤ اس منزل پر جو بائیں طرف کے راستے پر واقع ہے۔

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۟ (۱۸/۲۹)

ان سے کہدو کہ حق تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے آگیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے اختیار کرلے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔

دوسری جگہ ہے اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (۷۶/۳)۔ ہم نے اسے

راستہ دکھا دیا ہے اب اس کا جی چاہے تو اسے قبول کرلے۔ جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ سورۂ بلد میں ہے وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ (۹۰/۱۰)۔ ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (۲/۲۵۶)۔ ہدایت اور گمراہی۔ حق اور باطل۔ غلط اور صحیح۔ نکھر کر اس کے سامنے آگئے ہیں۔ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۭ (۶/۱۰۴)۔ جو آنکھیں کھول کر چلیگا اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ جو اندھا بن جائے گا، وہ خود نقصان اٹھائے گا۔

اس باب میں قرآن کریم کا ایک دوسرا انداز بیان بھی ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں یوں کہا گیا ہے کہ جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے گا، اس کا فائدہ اس کو ہوگا۔ جو بند کرلے گا وہ خود ٹھوکریں کھائے گا۔ لیکن کہیں اس بات کو

مَنْ يَّشَآءُ

اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۲/۱۴۲) اس آیت (اور اس جیسی اور آیات میں) مَنْ يَّشَآءُ کے معنی یہ نہیں کہ خدا جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت دے دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص صراط مستقیم کی طرف ہدایت لینا چاہتا ہے اسے اس طرف کی ہدایت مل جاتی ہے۔ وَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ (۱۴/۴)۔ اور جو غلط راستے پر چلنا چاہے، خدا کا قانون اسے غلط راستے پر چلاتا رہتا ہے۔ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ (۷/۱۸۶)۔ اور جو اس طرح خود تاریکیوں میں رہے، اسے کون راہ راست پر لا سکتا ہے؟ اس ضمن میں سورۂ نحل کی ایک آیت بڑی واضح ہے۔ آیت ہے۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ
وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۶/۹۳)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی جماعت یا فرقہ بنا دیتا۔ لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر چلاتا ہے۔ اور وہ تم سے پوچھے گا کہ تم نے کس قسم کے کام کئے تھے۔ یعنی پہلے وہ خود ہی انسانوں کی ایک جماعت کو غلط راستے پر ڈال دیتا ہے اور جب وہ اس راستے پر چل کر غلط کام کرتے ہیں، تو اس کے بعد ان سے پوچھتا ہے کہ تم نے ایسے کام کیوں کئے؟ آپ نے غور فرمایا کہ یہ پوزیشن (معاذ اللہ) کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ پہلے خود ہی کسی کو غلط راستے پر ڈال دینا اور اس کے بعد ہنٹر لے کر اس کے پیچھے پڑ جانا کہ تم غلط راستے پر کیوں چلے؟ یہی تھی وہ پوزیشن جسے حافظ نے اپنے شوخ انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

گناہ گرچہ نہ بود از خطائے ما حافظ
تو در طریق ادب کوش و گو خطائے من است

لیکن قرآن کریم کی آیت کے یہ معنی ہیں ہی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ کی مشیت میں ایسا ہوتا کہ تمام لوگ

مجبوراً ایک ہی راستہ پر چلیں تو وہ انہیں پیدا ہی اس طرح کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا کہ جس کا جی چاہے غلط راستہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے صحیح راستہ پر چلے۔ اور یہ اختیار و ارادہ اس لئے دیا گیا کہ اسے اس کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ اور اس سے پوچھا جائے کہ اس نے غلط راستہ کیوں اختیار کیا تھا۔ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص صحیح راستے پر چلنا چاہتا ہے اسے صحیح راستے کی طرف راہ نمائی مل جاتی ہے۔ جو غلط راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے اس کے سامنے غلط راستہ آجاتا ہے۔ یہاں اِقدام (INITIATIVE) انسان کے ہاتھ میں ہے۔ جو فیصلہ یہ اپنے لئے کرے، اسی کے مطابق خدا کا قانون اس پر منطبق ہو جاتا ہے۔ یہ آنکھیں بند کر لے۔ اس پر تاریکی چھا جائے گی۔ اگر آنکھیں کھول لے، راستہ روشن ہو جائے گا۔ یہی وہ بنیادی اصول ہے جسے ان چار الفاظ میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے کہ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۶۱/۵)۔ جب انہوں نے ٹیڑھی راہیں اختیار کر لیں تو خدا نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ آپ نے دیکھا کہ خدا کا قانون کس طرح انسان کے فیصلے کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ جیسا کچھ یہ اپنے آپ کو بنا لیتا ہے اسی قسم کا خدا کا قانون اس پر منطبق ہو جاتا ہے۔ جس قسم کا انسان، اُسی قسم کی اُس کی تقدیر۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

حرفِ بارکیش بہ رمزے مضمر است ۔۔۔ تو اگر دیگر شوی، او دیگر است
خاک شو۔ نذرِ ہوا سازد ترا ۔۔۔ سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی! افگندگی تقدیر تست ۔۔۔ قلزمی! پائندگی تقدیر تست

جو اصول افراد کے لئے ہے وہی اقوام کے لئے۔ اقوام سے متعلق فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)۔ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔ جس قسم کی نفسیاتی تبدیلی اس قوم میں ہو گی اسی قسم کی اس کی خارجی حالت ہو جائے گی۔

دل پر مہریں لگنا

افراد کی صورت میں وہ نفسیاتی تبدیلی جس سے انسان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے، "دل پر مہریں لگنے" کی اصطلاح سے تعبیر کی جاتی ہے۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (۲/۷) "اللہ نے ان کے دل پر اور کانوں پر مہر لگا دی۔ اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے"۔ یہاں اس "مہر لگنے" کی نسبت خدا کی طرف کی گئی ہے۔ لیکن دیگر مقامات میں وضاحت سے بتا دیا کہ یہ مہریں لگا کیسے کرتی ہیں۔ سورۂ جاثیہ میں ہے اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا معبود بنا لیا۔ جب انسان اس طرح اپنے جذبات

مغلوب ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ علم و عقل رکھنے کے باوجود، غلط راستے پر چلتا ہے وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ اسی کا نام دلوں اور کانوں پر مہریں لگ جانا۔ اور آنکھوں پر پردے پڑ جانا ہے۔ وَ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (۴۵/۲۳)۔ دوسری جگہ ہے كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ (۸۳/۱۴)۔ نہیں! بات یوں نہیں جیسے یہ لوگ بزعم خویش سمجھے بیٹھے ہیں۔ بات یہ ہے کہ خود ان کے اپنے اعمال زنگ بن کر ان کے دلوں پر جم جاتے ہیں۔ اس کو دل پر مہریں لگنا کہا جاتا ہے۔

رزق رزق کے معاملہ میں، قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ جو شخص (یا قوم) جس قدر رزق حاصل کرنا چاہے، اسے اسی قدر رزق مل جاتا ہے۔ جو فطرت کے قوانین کو سامنے رکھ کر ان کے مطابق کوشش اور کام کرے گا، اس کے منفعت بخش نتائج اسے مل جائیں گے۔ جو محنت نہیں کرے گا۔ یا محنت غلط طریق پر کرے گا، اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ (۱۳/۲۶)۔ جو شخص فراخی سے رزق لینا چاہتا ہے اسے فراخی سے مل جاتا ہے۔ جو نپی تلی روزی چاہتا ہے اسے نپی تلی ملتی ہے۔ خدا کا قانون، انسان کی سعی و کاوش کے مطابق نتیجہ پیدا کر دیتا ہے۔ رزق کی تنگی کے متعلق بتا دیا کہ وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (۲۰/۱۲۴)۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ اس کے مقابلہ میں کہا کہ وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ۔ اگر بستیوں والے، قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے اور تخریبی امور سے بچے رہتے تو ان پر زمین اور آسمان کی برکات کے دروازے کھل جاتے۔ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ (۷/۹۶)۔ لیکن انہوں نے ان قوانین کی تکذیب کی تو اپنے غلط کاموں کی بدولت پکڑے گئے۔ یوں قوانین خداوندی کی رو سے رزق کی بسط و کشاد ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ بغیر کسی قاعدے اور قانون اور سعی و عمل کے، جسے چاہتا ہے چھپر پھاڑ کر بے بہا رزق عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے ناپ تے دیتا ہے۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ خدا لوگوں کے اس قسم کے خود ساختہ تصورات سے بہت دور ہے۔

عزت اور ذلت عزت و ذلت کے سلسلہ میں سورہ آل عمران کی یہ آیت دھڑلے سے پیش کی جاتی ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ

تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۳/۲۶)۔ اور اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ "کہو کہ اے اللہ! تو مالک الملک ہے۔ تو جسے چاہے حکومت اور اقتدار عطا کر دے۔ جس سے چاہے چھین لے۔ جسے چاہے عزت دیدے جسے چاہے ذلیل کر دے۔ تیرے ہاتھ میں خیر ہے۔ یقیناً اللہ ہر شے پر قادر ہے"

پہلے اقتدار اور حکومت کو لیجئے۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ (۷/۱۲۸)۔ یقیناً ارض (حکومتِ ارضی) خدا کے تصرف میں ہے۔ اس کے بندوں میں سے جو اسے لینا چاہے، وہ اسے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق دیدیتا ہے۔ وہ قانونِ مشیت کیا ہے؟ فرمایا اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ (۲۱/۱۰۵)۔ وراثت ارض کا اصول یہ ہے کہ یہ انہیں ملتی ہے جن میں اسکی صلاحیت ہوتی ہے۔ قصۂ حضرت طالوت میں اس اصول کو اور واضح کر دیا۔ سوال زیرِ نظر تھا کہ بنی اسرائیل کے لشکر کی کمان کسے دی جائے۔ خدا نے اس کے لئے حضرت طالوت

کو منتخب کیا۔ بنی اسرائیل نے اس پر اعتراض کیا اور پوچھا کہ انہیں کس بنا پر منتخب کیا گیا ہے حالانکہ وہ غریب آدمی ہے۔ اس کے پاس فراواں دولت نہیں۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ اس کا معیار دولت نہیں۔ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ تم دیکھتے نہیں ہو کہ اسے کس قدر وسیع علم اور کتنی زیادہ جسمانی قوت حاصل ہے۔ اس بنا پر زمام اختیار اس کے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ اور اس کے بعد ہے وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ (۲/۲۴۷)۔ اللہ ان اختیارات کو اپنے قانون مشیت کے مطابق اسے عطا کر دیتا ہے جو انہیں حاصل کرنے کی استعداد اپنے اندر پیدا کرلے۔

جہاں تک عزت و ذلت کا سوال ہے، اس کے متعلق بھی قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اس کے لئے اصول کیا ہے۔ سورۂ فاطر میں ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۔ جو عزت حاصل کرنا چاہتا ہے اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ حقیقی عزت صرف خدا کے ہاں سے مل سکتی ہے۔ اس کے لئے اصول یہ ہے کہ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۚ (۳۵/۱۰)۔ انسان، طیب اور خوشگوار نظریۂ حیات کو اپنے سامنے بطور نصب العین حیات رکھ لے۔ اس قسم کے نظریہ میں از خود بھی اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بلندیوں کی طرف اٹھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جب اعمالِ صالحہ بھی شامل ہو جائیں۔ یعنی ایسے کام جو انسان کی ذات اور حسن کائنات کو سنوارنے والے ہوں — تو اس نظریۂ زندگی کو محیر العقول رفعتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ یوں، اس نظریہ کا حامل انسان، شرف و مجد کی بلندیوں تک پہنچتا چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس نے بتایا کہ ذلت اور پستی بھی انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہودیوں کے مختلف جرائم گنانے کے بعد

کہا کہ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ان پر ذلت و مسکنت کی مار ماری گئی۔ خدا کا یہ غضب اور تباہی ان پر اس لئے آئی کہ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (۲/۶۱)۔ وہ احکامِ خداوندی سے انکار اور سرکشی برتتے تھے۔ اور ناحق انبیاء کو قتل کر دیتے تھے۔ وہ ہر حکم کی نافرمانی کرتے تھے اور بڑے ہی حدود فراموش تھے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کی رو سے، عزت اور ذلت کے بھی اصول اور ضوابط ہیں۔ یہ نہیں کہ جب خدا چاہے یونہی بیٹھے بٹھلائے حکومت و ثروت اور عزت و تمکن عطا کر دیتا ہے۔ اور جس سے چاہے، بلا جرم و خطا، ان سرفرازیوں کو چھین لیتا ہے۔ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۳/۱۱۷)۔ خدا کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ لوگ خود اپنے اوپر زیادتی کرتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ لہذا، وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (۳/۲۵) کے معنی یہ ہیں کہ عزت اور ذلت خدا کے مقرر کردہ قوانین مشیت کے مطابق ملتی ہے۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ خدا نے ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر کر دیا ہے۔ اور ان قوانین و اصولات میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس نے انسان کو اس بات کا اختیار دیا ہے کہ وہ جی چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے تو ان کے خلاف روش اختیار کرے۔ وہ جس قسم کی روش اختیار کرے گا اس کے مطابق نتیجہ اس کے سامنے آجائے گا۔ اس باب میں اس پر کسی قسم کا جبر نہیں ہوتا۔ خدا اس کے اختیار و ارادہ کو سلب نہیں کرتا۔ وہ اس کے فیصلوں میں دخل نہیں دیتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

> جب میرے سامنے عمل کی ایک سے زیادہ راہیں کھلی ہوں، تو اس بات کا فیصلہ مجھے ہی کرنا ہو گا کہ میں ان میں سے کونسی راہ اختیار کروں)۔ خدا کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ میری جگہ خود محسوس کرنا یا حکم لگانا شروع کر دے۔ یا میرے لئے راستے کا انتخاب کر دے۔ (خطبات - صفحہ ۹۵)

بلکہ غور کیجئے تو خدا کا قانون خود میرے فیصلوں کا اتباع کرے گا۔ مثلاً سورۂ محمدؐ میں ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (۴۷/۷)۔ اے جماعت مومنین! اگر تم خدا (کے دین کی) مدد کرو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ اور تمہیں استقامت اور ثبات عطا کر دے گا۔ دیکھئے! یہاں پہل (INITIATIVE) انسان کی طرف سے ہے اور خدا کا قانون، انسان کے فیصلے

پیچھے پیچھے چلتا ہے اور اس حتم و یقین کے ساتھ کہ کَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۳۰/۴۷)۔ مومنین کی مدد کرنا ہم پر (خدا پر) فرض ہو جاتا ہے۔ وہ ضرور ایسا کرتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ خدا کی طرف سے عطا کردہ انسان کی آزادیوں کی کیا شان ہے؟

دنیا میں حیوانات کے سامنے ایک ہی راستہ ہوتا ہے اس لئے ان کی صورت میں انتخاب (CHOICE) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بکری کے سامنے گھاس اور گوشت دونوں رکھے ہوں۔ وہ گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔ گھاس کھانے لگ جائے گی۔ اس لئے کہ اسے اس کا اختیار ہی نہیں دیا گیا کہ وہ ان دونوں میں سے جسے چاہے اپنے لئے منتخب کرلے۔ اس کے برعکس، انسان کے سامنے بیک وقت مختلف ممکنات (POSSIBILITIES) ہوتی ہیں۔ اور یہ اس کے اختیار میں ہوتا ہے کہ ان میں سے جون راستہ چاہے منتخب کرلے۔ جس قسم کا راستہ یہ اختیار کرے گا اسی قسم کا نتیجہ اس کے سامنے آجائے گا۔ یہ اس کی تقدیر ہوگی۔ یعنی انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ مختلف راستوں میں سے جو راستہ چاہے اپنے لئے منتخب کرلے لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ جو راستہ اس طرح منتخب کرے، اس کا نتیجہ اپنی مرضی کے مطابق بدل لے۔ یہ نتیجہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مرتب ہوگا۔ یہاں انسان مجبور ہوگا۔

اس سے واضح ہے کہ انسان اپنے عمل میں صاحبِ اختیار ہے لیکن اس کا نتیجہ بدلنے کا اسے کوئی اختیار نہیں۔ یہ ہے جبر و قدر کا صحیح مفہوم۔

جو لوگ، انسان کو مجبورِ محض ٹھہراتے ہیں، ان کی طرف سے قرآن کریم کی دو ایک اور آیات بھی پیش کی جاتی ہیں جن کا صحیح مفہوم سامنے لانا بھی ضروری ہے۔ سورۂ دہر میں ہے اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ○ یہ قرآن تو ایک فراموش کردہ حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے۔ اس کے بعد جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف راہ اختیار کرلے۔ لیکن اس کے بعد ہے

مَا تَشَآءُوْنَ

وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۚ (۷۶/۳۰ - ۲۹)۔ (اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے) لیکن لوگ کچھ چاہ ہی نہیں سکتے۔ بجز اس کے جو خدا چاہے۔ اسی طرح سورۂ تکویر میں ہے اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۙ○ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۭ○۔ قرآن تمام اقوام عالم کے لئے یاد دہانی ہے۔ تم میں سے جو بھی سیدھے راستے پر چلنا چاہے (وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے) اور اس کے بعد ہے۔ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (۸۱/۲۹ - ۲۷)۔ (اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے) تم کچھ چاہ ہی نہیں سکتے بجز اس کے جو اللہ چاہے۔

آپ ان آیات اور ان کے ان تراجم پر غور فرمائیے۔ یعنی پہلے کہا گیا ہے کہ تم میں سے جس کا جی چاہے سیدھا راستہ اختیار کرلے۔ اور اس کے بعد ہے کہ تم اپنی مرضی سے کچھ چاہ ہی نہیں سکتے۔ تم تو مجبور ہو۔ تم وہی چاہ سکتے ہو جو خدا چاہے۔ یعنی تمہارا عمل ہی نہیں، بلکہ تمہارا ارادہ اور فیصلہ بھی خدا کے فیصلے کے تابع ہے۔ تم اس کے خلاف کچھ فیصلہ ہی نہیں کر سکتے۔ یعنی انسان سے کہا جا رہا ہے کہ تم اپنے فیصلے میں آزاد ہو۔ جو جی میں آئے اپنے لئے فیصلہ کر لو۔ اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔ بس اتنی سی پابندی ہے کہ تم خدا کے فیصلے کے خلاف کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتے۔ تمہیں اس کی استطاعت ہی نہیں کہ آزادانہ کوئی فیصلہ کر سکو۔ تمہارا ارادہ، خواہش۔ فیصلہ۔ انتخاب، وہی ہوگا جو خدا چاہے گا۔ تم اسے لاکھ اپنا فیصلہ کہو۔ وہ تمہارا فیصلہ ہو نہیں سکتا۔

آپ سوچئے کہ کیا خدا ایسی بات کہہ سکتا ہے کہ تم جس طرح کا جی چاہے فیصلہ کر لو۔ اس کا تمہارا اختیار ہے۔ اور اس کے بعد کہے کہ تم اپنے اختیار اور مرضی کے مطابق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ فیصلہ ہماری مرضی کے مطابق ہوگا۔ ایسا کہنا می نزد خدائے را۔ یہ خدا کے شایانِ شان نہیں۔ ان آیات کے معنی یہ ہیں کہ ویسے تو تمہیں اختیار ہے کہ اپنے لئے جس قسم کا فیصلہ جی چاہے کرو۔ لیکن تمہیں چاہئے کہ تم وہی فیصلہ کرو جو خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہو۔ مثلاً یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ تم سچ بولو یا جھوٹ۔ لیکن تمہارا عمل خدا کے قانون کے مطابق اسی صورت میں ہوگا کہ تم سچ بولو۔ جھوٹ نہ بولو۔ اس لئے تمہیں چاہئے کہ تم سچ بولنے ہی کا فیصلہ کرو۔ تمہارا یہ فیصلہ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوگا۔ اس لئے اس کا نتیجہ نہایت خوشگوار مرتب ہوگا۔ ہم نے تمہیں صحیح بات بتا دی ہے۔ آئندہ تمہارا اختیار ہے۔ اسے مان لوگے تو تمہیں خوشگواریاں نصیب ہوں گی۔ نہ مانو گے، تو نقصان اٹھاؤ گے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! قرآن کریم کی رو سے، خدا کی مرضی اور انسانی اختیار و ارادہ کی پوزیشن۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ہم ہر بات میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ خدا کو منظور ہی ایسا تھا۔ اس کی مرضی یہی تھی۔ انسان اس باب میں کیا کر سکتا ہے۔ آپ یہ معلوم کر کے یقیناً متعجب ہوں گے کہ قرآن کریم نے اسے راہ گم کردہ انسانوں کا عقیدہ اور دورِ جہالت پر مبنی نظریہ قرار دیا ہے۔ ذرا غور سے سنئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَ لَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ یہ مشرکین کہتے ہیں کہ اگر اللہ کو منظور نہ ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے آباؤ اجداد شرک کرتے۔ نہ ہی ہم یونہی کسی شے کو حرام قرار دیتے۔ (لیکن کیا کیا جائے۔ خدا کو منظور ہی ایسا تھا)۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ

تقدیر کا عقیدہ

كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ (یہ انہی پر موقوف نہیں) ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح حقیقت کو جھٹلایا تھا اور اپنے اعمال کو خدا کے سر تھوپنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ انہیں اپنے اعمال کے نتائج کا مزہ چکھنا پڑا۔ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ ان سے پوچھو کہ کیا تمہارے پاس ایسا کہنے کی کوئی سند اور دلیل ہے۔ اگر ہے تو اسے پیش کرو۔ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ (۶/۱۴۸)۔ (نیز ۱۰/۶۶) سند اور دلیل ان کے پاس کچھ نہیں یہ محض اپنے قیاسات کے پیچھے چلتے اور اٹکلیں دوڑاتے رہتے ہیں وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (۴۳/۲۰)۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر خدا کو منظور ہوتا تو ہم معبودانِ باطل کی پرستش کبھی نہ کرتے۔ انہیں حقیقت کا علم نہیں۔ یہ محض اٹکلے دوڑاتے ہیں۔ سورۂ یٰسین میں ہے وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ (۳۶/۴۷)۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم (محتاجوں کی ضرورت کے لئے) اس رزق کو کھلا رکھو جو خدا نے تمہیں دیا ہے، تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں، کہ کیا ہم ان لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام کریں، جنہیں اگر خدا چاہتا تو خود کھانے کو دے دیتا۔ (ان کے بھوکے رہنے سے تو صاف ظاہر ہے کہ خدا کی مرضی یہی ہے کہ یہ اسی حالت میں رہیں۔ ان کی حالت سنوارنے کے لئے کچھ کرنا خدا کی مرضی کے خلاف چلنا ہے۔ ہم ایسا کس طرح کر سکتے ہیں؟ کہا کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۶/۱۵)۔ ان سے کہو کہ تم لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ ایسا سمجھنا اور کہنا، کہ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو کبھی ایسا نہ ہوتا۔ قرآن کی رو سے کس قسم کا نظریہ اور کن لوگوں کا عقیدہ بتایا گیا ہے؟ یہ اس لئے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ انسان مجبورِ محض ہے۔ وہ اپنی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے انکار کرتا ہے۔ کہ انسانی ذات کا تو مطلب ہی اس کا صاحب اختیار و ارادہ ہونا، اور اپنے ہر فیصلہ اور عمل کا ذمہ دار بننا ہے۔ لہٰذا، یہ "منکر خویشتن شدن" ہے۔ اور جو اپنی ذات کا منکر ہے وہ خدا کا بھی منکر ہے۔

منکرِ حق نزدِ ملّا کافر است
منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

※

اس مقام پر برادرانِ عزیز! یقیناً آپ کے دل میں یہ خیال ابھرتا ہوگا کہ قرآن کریم کی اس قدر

ایسا کیوں ہوا؟

واضح تعلیم کے بعد مسلمانوں میں یہ خیالات اور معتقدات کیسے پیدا ہو گئے جو اس تعلیم کے یکسر خلاف ہیں، اور جنہوں نے اس یکسر حرکت و عمل امت کو شل اور مفلوج کر کے رکھ دیا؟ آپ کے دل میں ان خیالات کا ابھرنا فطری امر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اور بہت سے غلط اور گمراہ کن معتقدات کی طرح یہ نظریات و معتقدات بھی ہمارے دور ملوکیت کے پیدا کردہ اور عجمی سازش کے پروردہ ہیں۔ مسلمانوں کے مطلق العنان بادشاہوں نے جب ظلم و استبداد کے اسلوب اختیار کئے اور کمزور و ناتواں انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا تو ان مظالم کے خلاف لوگوں کے دلوں میں ردِ عمل پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اس ردِ عمل کو روکنے کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ ان بادشاہوں کو کب یہ اختیار حاصل ہو سکتا ہے کہ یہ لوگوں پر ظلم ڈھائیں۔ یہ بچارے تو خدا کی مشیت کے آلۂ کار ہیں۔ کائنات میں ایک پتہ بھی خدا کے حکم کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ اس لئے جو کچھ ان کے ہاتھوں سے ہوتا ہے، سب خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ حکومت و مملکت اس کی طرف سے ملتی ہے۔ وہی عزت دیتا ہے وہی ذلت۔ وہی راحت پہنچاتا ہے وہی تکلیف۔ اسکے حکم کے بغیر کوئی مصیبت نہیں آسکتی۔ اس لئے تم پر جو مصیبتیں آتی ہیں ان کے خلاف لب کشائی کرنا، خدا کی مرضی کے خلاف جنگ کرنا اور اس کے فیصلوں پر شکوہ سنج ہونا ہے۔ یہ کفر ہے۔ یہ الحاد ہے۔ انسان کو ہر حال میں راضی برضا رہنا چاہیئے۔ جو کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے اس میں انسان کی بہر حال بہتری ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے خلاف لب پر کچھ لانا تو ایک طرف، دل میں بھی شکایت کا جذبہ پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔

جب مستبد قوتوں نے رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے کر عوام کو روٹی سے محتاج کر دیا تاکہ وہ ان کے ہر اشارے پر چلنے کے لئے مجبور ہو جائیں، تو انہیں یہ افیون پلا کر سلا دیا گیا کہ رزق کی بسط و کشاد خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ جسے وہ چاہے بغیر حساب دے اور جسے چاہے نپی تلی دے۔ یہ خدائی تقسیم ہے جس کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کر سکتا۔ جو کچھ خدا نے امیروں کو دیا ہے، غریبوں کو اس پر حسد نہیں کرنا چاہیئے۔ انہیں ہر حال میں شکر کرنا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات، عقائد کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ جب تک مذہب کی طرف سے ان کی تائید نہ ہو۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا ہمیشہ گٹھ جوڑ رہا ہے۔ چنانچہ یہ حضرات آگے بڑھے اور ان خیالات کی تائید میں روایات وضع کرنی شروع کر دیں۔ اور چونکہ یہ تعلیم پہلے ہی سے عام کر رکھی تھی کہ قرآن کی آیات کی تفسیر روایات کی رو سے ہوتی ہے، اس لئے عوام میں ان خیالات کو "خدا اور رسول" کی تعلیم کی حیثیت سے پھیلا دیا گیا۔ اس عقیدہ کو کس قدر اہمیت دی گئی اس کا اندازہ اس ایک بات سے لگایئے

قرآن کریم کی رو سے ایمان کے اجزا پانچ ہیں۔ یعنی اللہ پر ایمان۔ اس کے رسولوں پر ایمان۔ اس کی کتابوں پر ایمان۔ ملائکہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان لانے سے ایک شخص مسلمان ہو جاتا ہے۔ لیکن

جزوِ ایمان

اب تقدیر کے اس عقیدہ کو، ایمان کا جزو بنا کر، کلمہ کے اندر داخل کر دیا گیا۔ چنانچہ اب مسلمان ہونے کے لئے ضروری قرار پا گیا کہ وہ یہ کہے کہ اٰمنت باللہ۔ و ملٰئکتہ۔ و کتبہٖ۔ و رسلہ ـــــــ والقدر خیرہٖ و شرہٖ من اللہ تعالیٰ۔ و بعث بعد الموت۔ یعنی جب تک ایک شخص، خدا۔ ملائکہ۔ کتب۔ رسل۔ اور آخرت کے ساتھ، تقدیر پر ایمان نہ لائے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ آپ نے غور فرمایا کہ مستبد قوتوں نے اس عقیدہ کو، کس شدت کے ساتھ، امت کے رگ و پے میں سرایت کر دیا ـــ ایسی شدت کے ساتھ کہ اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ انسان اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے، تو اسے مرتد قرار دے کر حوالۂ دار و رسن کر دیا جاتا۔

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ مسلمانوں میں اس قسم کے نظریات کا پھیلانا عجمی سازش کا نتیجہ تھا تو یہ بھی ایک تاریخی حقیقت کا بیان ہے۔ ایران کے شاہی جشن کا نام اساورہ تھا۔ (یعنی سونے کے کنگن پہننے والے)

عجمی سازش

یہ اکبر کے نورتنوں کی طرح، مختلف علوم و فنون پر ماہرین کی جماعت تھی۔ جب مسلمانوں نے ایران فتح کیا تو اس جشن شاہی نے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ اگر انہیں بھی مسلمانوں جیسی رعایات دی جائیں تو وہ مسلمان ہو کر اسلامی بستیوں میں آباد ہو جائیں گے۔ ان کی شرط منظور کر لی گئی اور یہ مسلمانوں کے شہروں میں پھیل گئے۔ اور وہاں، نہایت لطیف اور غیر محسوس انداز سے اپنے معتقدات و نظریات کی اشاعت شروع کر دی۔ تقدیر کے عقیدہ پر مجوسی (ایرانی) مذہب کی بنیاد تھی۔ انہوں نے اسے بھی عام کرنا شروع کیا۔ چنانچہ مسلمانوں میں سب سے پہلا فرقہ، مسئلہ تقدیر ہی کی بنا پر وجود میں آیا تھا۔ اس فرقہ کے بانی، معبد بن خالد کے متعلق تاریخ میں ہے کہ اس نے اس عقیدہ کو اساورہ کے ایک شخص سے مستعار لیا تھا جس نے اپنی کنیت ابو یونس رکھ لی تھی۔ چنانچہ اس طرح رفتہ رفتہ یہ عقیدہ جو مجوسی مذہب کا جزو تھا، خود مسلمانوں کا چھٹا جزوِ ایمان قرار پا گیا۔ یعنی ایمان کے پانچ اجزاء خدا کے مقرر کردہ، اور یہ چھٹا جزو، مجوسی اساورہ کا آوردہ!

ارباب اقتدار نے اس عقیدہ کو جزوِ ایمان بنوایا اور اس کے بعد اطمینان سے بیٹھ گئے کہ جو ان کے جی میں آئے کریں، مظلوموں اور ضعیفوں کے دل میں ان کے جور و استبداد کے خلاف احساس شکایت تک بیدار نہیں ہو سکتا۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اقبال نے اپنی مشہور نظم۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ۔

——— میں ابلیس کی زبان سے فخریہ کہلوایا ہے کہ

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا

اس کا نتیجہ اور یہی وہ عقیدہ جس کی بناء پر یہ امت جس نے اقوام عالم کی تقدیریں بدل کر رکھ دی تھیں اور تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا تھا، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی یا خود فریبی

عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

اگر اسے تقدیر کے چکر میں نہ الجھایا جاتا تو یہ اپنی ناکامی اور شکست کے وقت، کھڑا ہو کر سوچتا کہ مجھ سے کس مقام پر غلطی ہو گئی ہے۔ غلطی کے معلوم ہو جانے پر یہ اس کی اصلاح کرتا۔ اور اگر یہ دیکھتا کہ اس کا سبب وہ غلط نظام ہے جو اس پر مسلط کر دیا گیا ہے تو یہ اس نظام کو الٹانے کی سوچتا۔ لیکن اسے اس عقیدہ کی افیون سے اس طرح سلا دیا گیا کہ اسے نہ اپنی خامیوں اور غلطیوں کی اصلاح کا ہوش رہا اور نہ ہی غلط، مستبد نظام کے خلاف اٹھنے کا یارا۔ نتیجہ یہ کہ اس قوم کا عروج دن بدن مبدل بہ زوال ہوتا گیا اور ہم اس سطح پر جا پہنچے جس سے نیچے شاید ہی کوئی اور سطح ہو۔ اقبال ہی کے الفاظ میں۔

"تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز

تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

وہ قوم جس کی نگاہوں سے کبھی دنیا کی تقدیریں بدل جایا کرتی تھیں، آج خود ہر وقت اپنی تقدیر کا رونا روتی رہتی ہے۔ وہ جس کی پیشانی کے بل سے، امتوں کی بساطِ سیاست الٹ جایا کرتی تھی، آج اپنی "پیشانی کے لکھے" کے ہاتھوں مجبور و مقہور ہو کر سر بزانو بیٹھی ہے۔ وہ جس کے متعلق کہا تھا کہ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے یعنی زمین۔ چاند۔ سورج۔ ستارے، ان سب کو خدا نے تمہارے لئے تابع تسخیر کر دیا ہے' اس کی حالت یہ ہے کہ وہ آج اپنی تقدیر کو ستاروں کے تابع سمجھ کر نجومیوں سے فالیں لیتا پھرتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے

کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

کیا اس سے بڑا انقلاب بھی آسمان کی آنکھ نے کبھی دیکھا ہوگا۔ آپ نے غور کیا کہ ایک عقیدہ کے بدلنے سے کس طرح قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں! عقاید کی قوت بڑی ناقابلِ شکست اور ان کی

گرفت بڑی محکم ہوتی ہے۔ اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی اور قوت نہیں کر سکتی۔ غلط عقاید کی استخواں شکن گرفت کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں صحیح عقاید سے بدلا جائے۔ لیکن مفاد پرست قوتیں اس کی کبھی اجازت نہیں دیتیں۔ جن لوگوں کے دل میں ایسا خیال پیدا ہوتا ہے، یہ قوتیں، مذہبی پیشوائیت کو آگے بڑھا دیتی ہیں جو عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کرتی ہیں کہ دیکھو! یہ تمہیں ورغلا کر تمہارے اسلاف کے راستے سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ تمہارا ایمان خراب کرتا ہے۔ یہ تمہارا مذہب بگاڑتا ہے۔

گھبرانے کی بات نہیں

یہ ہے برادرانِ عزیز! جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ خدا کی زندہ و پائندہ کتاب ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے ہر مروجہ نظریہ اور عقیدہ کو اس کتاب کی روشنی میں پرکھیں۔ جس کی تائید اس سے ہوتی ہو اسے قابلِ قبول سمجھیں جس کی وہ تردید کرے اسے مسترد کر دیا جائے۔ اور جب اس طرح ہم صحیح قرآنی نظریات زندگی کے حامل ہو جائیں تو ہماری عظمتِ رفتہ ہمیں پھر سے مل سکتی ہے۔ اس لئے کہ

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں، تقدیر کا زندانی

قرآن کریم کا یہ بنیادی قانون یاد رکھئے کہ وَ مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (۴۲/۳۰)۔ جو مصیبت بھی تمہیں پہنچتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یا تو کوئی تمہاری اپنی ذاتی غلطی ہوتی ہے۔ اور یا اس کا ذمہ دار تمہارے معاشرہ کا غلط نظام ہوتا ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھنے والا، ہر مصیبت اور تکلیف کے وقت سوچے گا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ اگر وہ اس کی اپنی غلطی ہے تو اس کی اصلاح کرے گا۔ اور اگر اس کا ذمہ دار معاشرہ کا غلط نظام ہے تو وہ اس نظام کو بدلنے کی کوشش کرے گا۔ جب زاویۂ نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جائے اور معاشرہ کے نظام کو صحیح قرآنی خطوط پر متشکل کر دیا جائے، تو پھر نہ کوئی برکت، علاج کے بغیر بن آئی موت مرتا ہے اور نہ ہی کوئی مائی کا لعل بے آسرا رہ جانے کی وجہ سے صفِ ماتم بچھا کر روتی ہے۔ نہ کسی عبدالرزاق کو محنت کرنے کے باوجود فاقے کرنے پڑتے ہیں اور نہ کوئی شہامد خان، جائز و ناجائز طریق سے کمائی ہوئی دولت کے زور پر صاحبِ عزت بن سکتا ہے۔ نہ کسی نور خان کی بیوی کو لڑکی پیدا ہونے کے احساس سے سسکیاں بھرنی پڑتی ہیں اور نہ ہی کوئی نادرہ غلط جگہ شادی ہو جانے سے تپ دق میں مبتلا ہوتی ہے۔ اس معاشرہ میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۞ کی جنت بدوشِ فضا عام ہو جاتی ہے۔ اس میں مجرم کے علاوہ کسی کو نہ کسی قسم کا خوف دامنگیر ہوتا ہے، نہ حزن اور دل گرفتگی وجہِ پریشانی بنتی ہے۔

آخر میں، اتنا اور عرض کر دوں کہ مسئلۂ تقدیر جسے اس قدر پیچیدہ، مشکل بلکہ لاینحل بنا کر رکھ دیا گیا ہے، قرآن کریم نے اسے، قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں، دو فقروں میں حل کر دیا ہے۔ آدم سے بھی معصیت ہوئی اور ابلیس سے بھی۔ جب آدم سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے جواب میں کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا (۷/۲۳) - اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے اپنے آپ پر زیادتی کی۔ ہم قصوروار ہیں۔ یعنی اس نے اپنی غلطی کا ذمہ دار اپنے آپ کو ٹھہرایا۔ اس سے، اس پر توبہ کے دروازے کھل گئے۔ یعنی اس کے لئے اصلاحِ حال اور تغیرِ احوال کی گنجائش پیدا ہو گئی۔

لیکن جب ابلیس سے کہا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا۔ تو اس نے جواب میں کہا کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ رَبِّ بِمَا اَغْوَيْتَنِيْ (۱۵/۳۹) - پروردگار! تو نے مجھے گمراہ کیا۔ یعنی اس نے اپنی غلطی کے لئے، اپنی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور اپنے آپ کو مجبور ظاہر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ دھتکارا گیا۔ اس کے لئے اصلاحِ حال کی گنجائش ہی نہ رہی۔ اقبالؔ اسے، اس کی پستیٔ فطرت سے تعبیر کرتا ہے، جب کہتا ہے کہ

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دُود

ذمہ داری سے فرار کی وجہ، پستیٔ ہمت ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ ابدی مایوسی (ابلیس کے معنی ہی مایوس کے ہیں)۔ اس لئے کہ جو یہ کہتا ہے کہ میں خود کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھ سے سب کچھ کوئی اور کراتا ہے۔ وہ اپنی اصلاح یا حالات میں تبدیلی کیسے پیدا کر سکتا ہے۔ یاد رکھئے مایوسی قرآن کی رو سے کفر ہے — یعنی اپنی ذات کی ممکنات اور قانونِ خداوندی کی محکمیت سے انکار — یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق اقبالؔ نے کہا ہے کہ

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیرِ مسلمان
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

یعنی جو کچھ مشیتِ خداوندی کا پروگرام چاہتا ہے کہ دنیا میں ہو، مومن اپنے اختیار و ارادے سے بطیبِ خاطر وہ کچھ کر کے دکھا دیتا، اور یوں تقدیرِ الٰہی بن جاتا ہے۔ مومن کی تقدیر پہلے سے لکھی ہوئی نہیں ہوتی۔ یہ اپنی تقدیر آپ بناتا ہے۔ اسی لئے، مومن سے، کہا گیا ہے کہ

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں

خدا کا یہ ارشاد کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰) — تم اپنی مرضی کے مطابق جو چاہو کرو — اس باب میں حرفِ آخر ہے۔ عالمِ امر میں خدا کی مشیت کارفرما ہے جس میں انسان دخل نہیں دے سکتا۔ عالمِ کون و فساد میں انسان کو صاحبِ مشیت بنایا گیا ہے جس میں خدا اپنے لامحدود اختیارات کے باوجود، دخل نہیں دیتا۔ وَ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۳۰/۳۰)

انسانی آزادی کی یہ تعلیم قرآن کریم کی منفرد خصوصیت ہے جو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر خدا کو اس طرح قوانین کا پابند بنا دیا جائے تو اس کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف آتا ہے۔ لیکن یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اگر کوئی اور ہستی خدا کے اختیارات پر کسی قسم کی پابندی عائد کرے تو اس سے واقعی خدا کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف آسکتا ہے۔ لیکن اگر خدا، خود اپنی مرضی سے اپنے آپ پر کوئی پابندی عائد کرتا ہے تو اس سے اس کے صاحبِ اختیار ہونے پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بلکہ اس کے صاحبِ اختیار ہونے کی ایک اور دلیل اور شہادت ہے۔ مثلاً اس نے قرآن کریم میں کچھ احکام اور اصول دیئے ہیں اور اس کے بعد کہہ دیا ہے کہ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۱۰/۶۴)۔ خدا کے ان احکام و اصول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اس سے خدا نے خود اپنے اوپر ایک پابندی عائد کر لی ہے کہ وہ ان احکام میں تبدیلی نہیں کرے گا۔ اس باب میں یوں کہا جائے گا کہ خدا ایسا کر تو سکتا ہے لیکن وہ ایسا کرتا نہیں۔

یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ قوانین خداوندی کی اطاعت سے، خدا کی ذات درمیان میں سے نکل جاتی ہے۔ خدا کی اطاعت کرنا چاہیئے۔ قوانین خداوندی کی اطاعت نہیں۔ یہ اعتراض کرنے والے وہ لوگ ہیں جو دن رات کہتے رہتے ہیں کہ ہمیں احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ اگر احکامِ خداوندی کی اطاعت سے، خدا درمیان میں سے نہیں نکل جاتا تو قوانین خداوندی کی اطاعت سے خدا درمیان میں سے کس طرح نکل جاتا ہے؟ انہیں کون سمجھائے کہ جب کوئی حکم غیر متبدل ہو (یعنی وہ ہر روز بدلتا نہ رہے) تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ خدا کے غیر متبدل احکام ہی خدا کے قوانین ہیں جن کی اطاعت ضروری ہے۔

اس پر یہ کہا جائے گا کہ تم، خدا کی مرضی یا خدا کا حکم کیوں نہیں کہتے۔ خدا کا قانون کیوں کہتے ہو؟ یہ اس لئے کہ خدا کی مرضی یا حکم کے متعلق ہمارے ہاں جو عام تصور پیدا ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی مرضی اور حکم ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔ یہ تصور قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس کی مرضی جو اس کے احکام کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے، غیر متبدل ہے اس لئے اسے قانون کہنا انسب ہے۔ اس کا عملی نتیجہ بڑا دور رس ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں وہی حکومت انسانیت کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے جو صفاتِ خداوندی کی مظہر ہو۔ اب اگر ہم خدا کے متعلق یہ تصور رکھیں کہ اس کے احکام ہر آن بدلتے رہتے ہیں اور وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں تو اس تصور کے مطابق جو حکومت یہاں قائم ہوگی (اور جسے حکومتِ خداوندی کہا جائے گا) اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قسم کی ہوگی! کیا اس قسم کی حکومت کو آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی برداشت کر سکتے ہیں جو نہ کسی قاعدے کی پابند ہو نہ قانون کی! یاد رکھیے! خدا کے تصور کا ہماری عملی زندگی پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ جس قسم کا کسی قوم کا خدا ہو اسی قسم کی اس قوم کی زندگی۔ قرآنی تصور کا خدا، اپنی لا انتہا قوتوں کے باوجود، قاعدے اور قانون والا خدا ہے اس لئے اسے ماننے والی قوم بھی دنیا میں انتہائی درجے کی قاعدے اور قانون کے مطابق چلنے والی قوم ہوگی۔ یہی تقدیر کا عملی مفہوم ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ جس قوم کو ہزار برس سے ملوکیت کا محکوم رکھا گیا ہو وہ حکم کی اطاعت تو سمجھ سکتی ہے، قانون کی اطاعت اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ملوکیت قانون کے تصور کی طرف آنے ہی نہیں دیتی۔

(بقیہ تعارف از صفحہ ۸)

ہے۔ ان میں سے بعض تنگ آکر ہماری سست روی پر طعنہ زن بھی ہوتے ہیں لیکن جب وہ اس سلسلے میں اپنی روش بدلنے پر آمادہ نہیں کر سکتے تو ان میں سے کچھ تو یہ کہہ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ (کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک) اور بعض اپنے جذبات کی تسکین کے لئے دوسری راہیں تراش لیتے ہیں ہمیں نہ اُن سے کوئی گِلہ ہے نہ اِن سے کوئی شکایت۔

میں یہ داستان اس لئے دہرا رہا ہوں کہ آپ میں سے جو احباب اپنے دل میں اس بادیہ پیمائی کا ولولہ رکھتے ہوں وہ اس مرحلہ کی شکیب آزمائی کا اچھی طرح اندازہ کرلیں اور خوب سمجھ لیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کام اپنے اندر انقلاب پیدا کرنا ہے۔ پہلے ذہنی انقلاب اور پھر قلبی انقلاب۔ اور جب تک وہ اس مرحلہ سے گزر نہیں جاتے کوئی دوسرا پروگرام ان کے سامنے نہیں آسکتا۔

بعض حضرات کہا کرتے ہیں کہ ہم نے اس فکر کو عام بھی کر دیا تو اس سے کیا حاصل ہوگا۔ قرآن کا مقصد تو اس نظام کو عملاً متشکل کرنا ہے۔ کیا اس فکر کی عام نشر واشاعت سے یہ نظام متشکل ہو جائے گا؟ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اب تو خود زمانہ کے تقاضوں نے حالات میں ایسی تبدیلی پیدا کردی ہے کہ کسی خیال کے عام کر دینے سے معاشرہ کا نظام خود بخود اُس کے مطابق متشکل ہو جاتا ہے۔

یہ زمانہ جمہوریت کا ہے جس میں انقلاب آئینی طور پر (CONSTITUTIONALLY) برپا ہوتے ہیں۔ جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ جس خیال کے حامل زیادہ ہوں اسی کے مطابق نظامِ مملکت متشکل ہو جائے۔ آپ اس فکر کو عام کیجئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح یہ انقلاب معرضِ وجود میں آتا ہے

قرآنی نظامِ ربوبیت خود اپنے اندر اتنی صلاحیت اور قوت رکھتا ہے کہ دنیا کا کوئی اور نظام یا تصور اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے ابھی تک دنیا کے سامنے پیش ہی نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ جو حضرات اسے دوسروں کے سامنے پیش کریں وہ خود اسے اچھی طرح سمجھے ہوئے ہوں اس لئے کہ تجربہ نے بتایا ہے کہ اس تحریک کو اتنا نقصان مخالفین کے ہاتھوں نہیں پہنچا جتنا ان موافقین کی طرف سے پہنچتا ہے جو اس کی ماہیت سے خود اچھی طرح واقف نہیں ہوتے اور لوگوں سے طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی یہی باتیں مخالفین کے لئے اعتراض کی بنیاد بن جاتی ہیں۔

اب میں حضرات! چند الفاظ ان رفقائے سفر کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اس مقصد کے لئے قدم آگے بڑھایا ہے۔

آپ حضرات کی کوششیں یقیناً قابلِ تحسین ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہم غریب و نادار ہیں — ہم بے بضاعت اور بے سروسامان ہیں۔ لیکن "قرآن" اس پر شاہد ہے کہ آسمانی انقلاب کی ابتداء ہمیشہ غریبوں اور ناداروں کی طرف سے ہوئی ہے۔ لہذا آپ اپنی بے بضاعتی سے بالکل نہ گھبرائیں اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیئے کہ —

قرآنی نظام کی تحریک میں السابقون الاولون کے حصے میں سختیاں ہی سختیاں ہوتی ہیں ان کے ذمے قربانیاں اور قربانیاں ہی ہوتی ہیں۔ انہیں لہو پسینہ ایک کر کے اس بیج کو بونا ہوتا ہے۔ کاٹنا پتہ نہیں کس کے نصیب میں ہو لہذا اس راستے میں جس قدر محنت درکار ہوگی اس کا اندازہ لگا لینا نہایت ضروری ہے۔

آپ یہ بھی سوچ لیجئے کہ آپ اس آواز کو لیکر اٹھ رہے ہیں لیکن اگر (خدانخواستہ) آپ کی غفلت یا کم ہمتی سے یہ آواز ناکام ہوگئی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ صدرِ اول کے بعد ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ قرآنی نظام کی آواز بلند ہو رہی ہے اگر یہ آواز ہماری کمزوریوں کی وجہ سے ناکام رہ گئی تو اس نظام کے متعلق سطح بین نگاہوں کا شبہ یقین میں بدل جائے گا کہ اس میں عملاً قائم ہونے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں۔

اس لئے برادران! آپ سوچ لیجئے کہ اس نظام کے داعی بننے سے آپ کتنی عظیم ذمہ داری اپنے سر پر لے رہے ہیں۔ آپ کی ناکامی آپ کی ناکامی نہیں سمجھی جائے گی خود اس نظام کی ناکامی قرار پا جائے گی۔ اس لئے آپ یا تو اس کے لئے قدم ہی نہ اٹھایئے اور اگر اٹھانا ہے تو پھر اس قدم کو پیچھے نہ ہٹایئے۔ آپ جو فیصلہ بھی کیجئے سمجھ سوچ کر کیجئے، محض جذبات کی بنا پر نہ کیجئے۔ یہ معاملہ بڑا نازک ہے، ایسا نہ ہو کہ ہماری وجہ سے قرآن کا پیغام بدنام ہو جائے۔ قرآن کا نظام تو بہر حال قائم ہو کر رہے گا۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا لیکن ایسا نہ ہو کہ جب اس کی تاریخ سامنے آئے تو اس میں ہمارے متعلق یہ درج ہو کہ ان کی وجہ سے اسے ایک اور دھکا پیچھے کی طرف لگا تھا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ٥

کراچی میں رسالہ طلوعِ اسلام اور کتابوں کے ملنے کا پتہ

★ محمد اسلام صاحب - نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام - ۱۰۰-بی لوئس روڈ، نیو ٹاؤن کراچی

★ انوار کی صبح —— سندھ اسمبلی ہال - بندر روڈ - کراچی۔

کچھ کتابوں کی بابت

(۱) ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع شدہ کتابوں نے ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و دماغ میں صحیح قرآنی انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یہی ہمارے لٹریچر سے مقصود ہے۔

(۲) طلوع اسلام ایک مشنری ادارہ ہے اور اس کی قرآنی تحریک کے قیام اور فروغ کا دارو مدار بیشتر انہی کتابوں کی آمدنی پر ہے اس لئے اس باب میں آپ کا تعاون خود اس تحریک کی تائید کا موجب بھی ہوگا۔

(۳) کتابوں کا اشتہار آپ کو رسالہ کے مختلف مقامات پر ملیگا۔ نیز رسالہ کے اندر ایک کارڈ چسپاں ہوگا۔ جس میں ان کتابوں کی فہرست درج ہوگی اس سے آپ کتابوں کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

(۴) کتابوں کی فرمائش بھیجتے وقت ضروری ہے کہ آپ فرمائش کی مجموعی قیمت کا کم از کم دسواں حصہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں۔ بقایا کا وی۔ پی۔ آپ کے نام بھیجدیا جائے گا۔

(۵) کتابوں پر ڈاک کا خرچ بہت پڑ جاتا ہے۔ اگر آپ اس خرچ کی بچت چاہتے ہیں تو اس کیلئے آپ ہمارے "پیشگی خریداروں" کے حلقہ میں شامل ہو جایئے۔ اسکا طریقہ یہ ہے کہ آپ سو روپے کی رقم (یک مشت یا چار اقساط میں) پیشگی جمع کرا دیں۔ اس کے بعد جو کتاب آپ طلب فرمائینگے آپکو بھیجدی جائیگی اور اس پر ڈاک کا خرچ ہم خود برداشت کریں گے۔ آپکا حساب ہمارے ہاں باقاعدہ رہیگا اور زر پیشگی کے ختم ہونے پر (یا ساتھ کے ساتھ) آپ اس میں مزید پیسے جمع کرا دیں گے۔

(۶) دستی کتابیں ادارہ سے (دفتر کے اوقات میں مل سکتی ہیں۔

(۷) احتیاط کے باوجود، حساب میں بعض اوقات غلطی ہو سکتی ہے اسلئے حساب فہمی میں ضبط و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔ دانستہ بدمعاملگی اس ادارہ میں کبھی نہیں ہوگی۔

والسلام — (ناظم)

چند اہم کتابیں

(۱) **اسبابِ زوالِ امت** :- یہ سمجھنے کے لئے کہ حقیقی اسلام کیا تھا اور اس کے بعد اس پر کیا گزری۔ یہ کتاب بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔

(۲) **مقامِ حدیث** :- یہ الزام آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ طلوع اسلام "منکرِ حدیث" ہے لیکن اس کی تفصیل شاید آپ کو معلوم نہیں ہوگی کہ احادیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے یہ کسطرح مرتب ہوئیں اور کسطرح ہم تک پہنچیں۔ انکے اقرار اور انکار سے مراد کیا ہے علم حدیث کے موضوع پر یہ کتاب بڑی جامع ہے۔ قیمت ۳ روپے

۳۔ **اسلامی معاشرت** ۔ روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کے احکام کیا ہیں۔ انہیں بچوں، عورتوں، کم تعلیم یافتہ لوگوں کیلئے نہایت سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت ۲ روپے
۴۔ **بہارِ نو** ۔ پرویز صاحب کے انقلاب آفریں، بصیرت افروز، دلکش مضامین کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت ۵ روپے
طاہرہ کے نام خطوط ۔ عورتوں کی زندگی سے متعلق ھدایات اور احکام، خطوط کی شکل میں، انداز دلکش بیان سادہ۔ مضامین پُر مغز۔ راہ نمائی قرآن ــــ قیمت حصہ اول دو روپے۔ حصہ دوم اڑھائی روپے۔
ان کتابوں پر محصول ڈاک الگ ہوگا۔ لیکن اگر آپ پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل ہیں تو پھر آپ کو محصولڈاک نہیں دینا پڑے گا۔ (اس کی تفصیل صفحہ ۴۹ پر ملاحظہ فرمایئے۔)

(ناظم)

خریداروں سے

(۱) ۔ آپ کا چندہ بذریعہ منی آرڈر وصول ہو یا وی۔ پی کے ذریعے۔ یا اسے آپ دستی ادا کریں۔ ہر حال میں ادارہ کی طرف سے ایک چھپی ہوئی رسید جاری ہوگی جس پر آپ کا نمبر خریداری دیا جائیگا۔ اور یہ بھی تصریح ہوگی کہ چندہ کی میعاد کب سے کب تک ہے۔

(۲) جس ماہ آپ کا چندہ ختم ہوگا اس ماہ کے رسالہ میں ایک کارڈ منسلک ہوگا جس میں اس امر کی اطلاع دی جائے گی۔ اس کے جواب میں آپ کا چندہ موصول ہونے پر آپ کا رسالہ جاری رہ سکے گا۔ ورنہ بند کر دیا جائے گا۔ (ویسے) اس اطلاعی کارڈ کے بغیر بھی آپ کو علم ہوگا کہ آپ کا چندہ کس ماہ میں ختم ہو رہا ہے اس لئے رسالہ جاری رکھنے کے لئے چندہ کی ترسیل آپ کا فریضہ ہوگا۔

(۳) رسالہ ہر ماہ کے شروع میں ٹھیک ٹھیک چیک کر کے حوالہ ڈاک کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو رسالہ نہ ملے تو اس کی اطلاع اس ماہ کی پندرہ تاریخ تک دیں۔ اسکے بعد اطلاع ملنے کی صورت میں رسالہ بشرط موجودگی قیمتاً بھیجا جا سکے گا۔

(۴) پتہ کی تبدیلی کی اطلاع بیس تاریخ تک مل جانی چاہیئے اگر یہ اطلاع نہیں ملیگی تو پرچہ سابقہ پتہ پر بھیجا جائے گا۔

(۵) اکثر پرچے ڈاک میں گم ہو جاتے ہیں اس لئے آپ اپنے ہاں کے مقامی ڈاکخانے کو بھی تاکید کر دیں کہ آپکا پرچہ آپ تک پہنچا دیا کرے۔ یہاں سے پرچہ چیک کر کے بھیجا جاتا ہے۔

(۶) احتیاط کے باوجود، بعض اوقات حساب میں غلطی ہو سکتی ہے۔ اس لئے حساب فہمی کے سلسلہ میں ضبط اور تحمل سے کام لینا اچھا ہوتا ہے۔ اس ادارہ میں دانستہ بد معاملگی کبھی نہیں ہوگی۔

(۷) آپ کا تعاون ہر حال میں ہمارے لئے شکریہ کا موجب ہوگا۔ والسلام۔ (ناظم ادارہ)

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصوّر سامنے آجاتا

لغاتُ القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری بھی ہے نئے انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے مکمل سیٹ کی رعایتی قیمت پچاس روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصوّرات کا نہایت حسین اور دلکش مرقع قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) جیبی ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔
جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دلکش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔
جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین۔ مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت: بارہ روپے

نظامِ ربوبیّت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصوّرات۔ (آٹھ روپے)

ن و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دُعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

رق طُور — صاحبِ ضرب کلیمؑ اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان۔ جو یوں کہیے کہ خود ہماری استان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰ کی بصیرت افروز داستانِ حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا پ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

لسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

جر الاسلام
حی الاسلام
مصر کے نامور مؤرخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکۃ آراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالمِ اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔
(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

فتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مؤرخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اسکے دل میں سینکڑوں شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوسئے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد۔ پہلی جلد آٹھ روپے۔ دوسری اور تیسری جلد … روپے فی جلد

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ مجلد۔ بارہ روپے

عہد آفریں کتابیں

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد بیس روپے۔ مکمل سیٹ پچپن روپے

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسلمانوں کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتاتی ہے کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اسکی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اول۔ آٹھ روپے۔ سستا ایڈیشن۔ چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام — ۲۵ بی۔ گلبرگ — لاہور